www.shibliinternational.com

June 2021 جون

ISSN: 2581-9216

ماہنامہ صدائے شبلی حیدرآباد

Urdu Monthly **SADA E SHIBLI** Hyderabad

ایڈیٹر مولانا ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

قیمت: -/20 روپے

Issue 40 شمارہ_Vol 4 جلد:

جون June: 2021

ماہنامہ

حیدرآباد

صدائے شبلی

مدیر: ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

نائب مدیران: ڈاکٹر سراج احمد انصاری ☆ ڈاکٹر عبدالقدوس ☆ ابوہریرہ یوسفی

مجلس مشاورت:

پروفیسر اشتیاق احمد ظلی، پروفیسر مظفر علی شہہ میری
پروفیسر محسن عثمانی ندوی، پروفیسر ابوالکلام
پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی، ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی، مفتی محمد فاروق قاسمی
مولانا ارشاد الحق مدنی، مولانا محمد مساعد ہلال احیائی
اعجاز علی قریشی ایڈوکیٹ، محمد سلمان انجینئر

مجلس ادارت:

ڈاکٹر محمد رفیق، ڈاکٹر حمران احمد، ڈاکٹر جاوید کمال، ڈاکٹر ناظم علی، ڈاکٹر مختار احمد فردین، ڈاکٹر غوثیہ بانو، ڈاکٹر سید امام حبیب قادری، ڈاکٹر سمیہ تمکین، ڈاکٹر فاروق احمد بھٹ، ڈاکٹر مصطفیٰ خان، مولانا عبدالوحید ندوی، مولانا احمد نورعینی، ڈاکٹر مصلح الدین نظامی، ابوہریرہ ایوبی، محسن خان

SADA E SHIBLI
A/c: 13271024000023922
Ifsc: IBKL0001327
IDBI Bank: CHARMINAR HYD, T.S

قیمت فی شمارہ: 20 سالانہ: 220
رجسٹرڈ ڈاک: 350- بیرونی ممالک: 50/ امریکی ڈالر
خصوصی تعاون: 1000

ماہنامہ "صدائے شبلی" حیدرآباد میں مقالہ نگاران سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

ہر طرح کی قانونی چارہ جوئی صرف حیدرآباد کی عدالت میں ہوگی

محمد محامد ہلال (اونر، پبلشر، پرنٹر، ایڈیٹر) نے دائرہ الیکٹرک پریس میں چھپوا کر حیدرآباد تلنگانہ سے شائع کیا

خط و کتابت کا پتہ

Mob: 9392533661 - 8317692718

Email: sadaeshibli@gmail.com

MOHD MUHAMID HILAL #17-6-352, B1, 2nd Floor, Bafana Complex,
Near Asfya Masjid Dabirpura Road, Purani Haveli, Hyderabad- 500023. T.S

فہرست مضامین

۱	اپنی بات	ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی	۵
۲	حمد باری تعالیٰ	جہانگیر قیاس	۶
۳	نعت شریف	صفی الرحمٰن صفی	۶
۴	اخلاقِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم	علامہ شبلی نعمانیؒ	۷
۵	دیباچوں میں ذکر شبلی کا مطالعہ	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	۸
۶	نجات کا اٹل قانون	مولانا حبیب الرحمٰن	۱۲
۷	کتاب ''شبلی شناسی کے سو سال'' میری نظر میں	مولانا انصار احمد معروفی	۱۴
۸	عبدالرحمٰن جامیؔ (میرے استاد)	ڈاکٹر رحیم رامش	۱۸
۹	شگوفہ کا باون سالہ سفر: بہ یک نظر	ڈاکٹر محمد انور الدین	۱۹
۱۰	ذات پات کی لعنت، اصلاح کی کوششیں اور مستقبل کے خدشات	احمد نور عینی	۲۳
۱۱	سوشل میڈیا اور اس کے مثبت و منفی اثرات	مصطفیٰ علی	۲۷
۱۲	بین القصرین (عربی ناول) تجزیاتی مطالعہ کے آئینے میں	نواز احمد	۳۲
۱۳	اُردو زبان	سید عظمت اللہ بیابانی	۳۵
۱۴	اہل فلسطین کے نام (نظم)	فضیل فوز	۳۷
۱۵	غزل	سید نوید جعفری	۳۷
۱۶	نیت	سیدہ تبسم منظور ناڈکر	۳۸
۱۷	تذکرۂ انبیاء (تبصرہ)	محمد یٰسین ہابیل	۴۰

ماہنامہ ''صدائے شبلی'' کے خصوصی معاونین

جناب **ابو سفیان** اعظمی، مقیم حال ممبئی... جناب **محمد یوسف** بن الحاج محمد منیر الدین عرف ولی مرحوم، حیدرآباد

مفتی **محمد فاروق قاسمی** ۔صدر علماء کونسل وجے واڑہ، آندھرا پردیش

ڈاکٹر سید **جلیل حسین** ایم ڈی (علیگ) ٹولی چوکی حیدرآباد

ڈاکٹر **شہباز احمد**، پروفیسر گورنمنٹ نظامیہ طبی کالج چارمینار، حیدرآباد

مولانا **محمد عبدالقادر سعود** نائس جوس سینٹر سکندرآباد، حیدرآباد

الحاج **محمد قمرالدین** نبیل کالونی بارکس حیدرآباد

الحاج **محمد عبدالکریم** ۔صدر مسجد اشرف کریم کشن باغ، حیدرآباد

اپنی بات

کورونا وائرس کی دوسری لہر کی تباہی ہمارے ملک کے تقریباً ہر گھر میں دستک دے چکی ہے، اس مہلک مرض اور اس کے اثرات سے کس طرح اپنے صحت کی حفاظت کی جائے، اس سے طبی ماہرین عاجز نظر آرہے ہیں۔ اگر مذہبی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو علاج کے ساتھ ان سوالات کے جوابات توبہ واستغفار، صدقات، تصحیح نیت اور عدل وانصاف کی صورت میں نظر آتا ہے۔ اگر ہم نفسیاتی زندگی کو چھوڑ کر احکامِ الٰہی پر عمل پیرا ہوں تو حالات تبدیل ہوں گے۔ یہ فانی دنیا دارالاسباب ہے، اس لیے حالات کو بہتر بنانے کے لیے مضبوط منصوبہ بندی کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ کام اربابِ حل وعقد وعام لوگوں سے وابستہ ہے۔ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ معیاری اسپتال اور معالج کا انتظام کرے تاکہ بروقت مریض کو علاج کے اسباب فراہم ہوسکیں، اس وبا نے اس شعبۂ صحت کو ایسا وا کیا ہے کہ اسے صدیوں تک ناکامیوں کے ساتھ یاد رکھا جائے گا۔ ہمارے ملک میں قومی یکجہتی کا تانا بکھیر کر حکمرانوں کو گدّی پر براجمان ہونے کا شوق ہے، حالانکہ عوام کے ٹیکس کا پیسہ ان کے خون پسینہ میں شامل رہتا ہے اور عوام اسی وجہ سے حکمراں بناتی ہے کہ یہ لوگ ہماری پریشانیوں میں کام آئیں گے اور ہمارے جان ومال کا تحفظ کریں۔ ہمارے ملک کی موجودہ حکومت "سب کا ساتھ، سب کا وکاس" کے نام پر آئی تھی، مگر اس وقت عالم یہ ہے کہ روزگار نہیں ہیں اور جو نوکریاں تھیں وہ ختم ہورہی ہیں، اور جو باقی ہیں، ان پر بھی خطرات کے بادل منڈلا رہے ہیں۔ اور مہنگائی آسمان چھو رہی ہے۔

اس وبا میں جہاں بہت ساری اموات ہوئیں، وہیں عوام کو مختلف پریشانیوں سے دوچار بھی ہونا پڑا، بعض ریاستوں میں یہ بھی دیکھا گیا کہ لاک ڈاؤن کے نرمی اوقات میں جو لوگ شدید ضروریات کے لیے باہر نکلے تو ان پر بھاری چالان کا بوجھ ڈال دیا گیا، نظرانداز اور درگزر کی جگہ مجبور ومعذور پر ستم بالائے ستم ہورہا ہے۔ اب بھی وقت معاف کرنے اور حالات کو درست کرنے کا ہے۔ حکومت کا نمائندہ رعایا کا خادم ہوتا ہے، اسی وجہ سے اس پر دوہری ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ رعایا کو ہر ممکنہ سہولت پہنچائے۔

وفیات کا سلسلہ جاری ہے، ان میں سے کچھ ایسے تھے کہ جو ہمارے ملک اور ہماری قوم کی زینت تھے۔ ان میں مولانا سید محمد حمزہ حسنی، ڈاکٹر عبداللہ، مولانا اسیر ادروی، مفتی عبدالرزاق بھوپال، مولانا نذرالحفیظ ندوی، پروفیسر خالد سعید اور مولانا محمد ابصارالحق قاسمی وغیرہ ہیں۔ آخرالذکر دیارِ مشرق کے مردم خیز شہر مئوناتھ بھنجن یوپی کے رہنے والے تھے، آپ دارالعلوم دیوبند کے فاضل تھے۔ آپ کی سماجی، تعمیری، علمی وادبی خدمات کی وجہ سے شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد نے "افتخار علماء" کے ایوارڈ سے نوازا تھا۔ آپ تاحیات ٹرسٹ کے معاون رہے۔ اللہ رب العزت تمام مرحومین کی مغفرت فرمائے۔ ادارہ ان حضرات کی خدمات کو خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے۔

محمد محامد ہلال اعظمی

جہانگیر قیاس۔ حیدرآباد

حمد باری تعالیٰ

واحد ہے تو بجز ترے کوئی خدا نہیں
سر میرا اور کسی کے آگے جھکا نہیں

موذی وبا کو ختم تو کردے مرے خدا
تیرے سوا ہمارا کوئی آسرا نہیں

بھٹکے ہوئے ہیں جتنے مسلمان نوجوان
توفیق دے الٰہی ترے بس میں کیا نہیں

جب تک نہ چاہے تو کوئی اچھا نہ ہو سکے
کوئی دوا میں بھی یہاں شفا نہیں

ہر شئے کو ہے زوال، فقط تو ہے لازوال
فانی ہر ایک چیز ہے، تجھ کو فنا نہیں

سانسیں اکھڑ رہی ہیں مریضوں کی اے قیاسؔ
اس سے بڑی خدا کی کوئی بھی سزا نہیں

صفی الرحمن صفی
پورہ معروف مئوناتھ بھنجن (اتر پردیش)

نعت شریف

ایک سے ایک بہتر مدینے میں ہے
ہر کوئی ماہ واختر مدینے میں ہے
سب رسولوں کا سرور مدینے میں ہے
یعنی محبوب داور مدینے میں ہے
اک فضائے منور مدینے میں ہے
نور جنت سے بہتر مدینے میں ہے
جس کے آگے زباں دانیاں گنگ تھیں
ایک ایسا سخنور مدینے میں ہے
زائرو! جانب ارض طیبہ چلو
شافع روز محشر مدینے میں ہے
جس کے در سے نہ مایوس کوئی ہوا
ایسا داتا تونگر مدینے میں ہے
یوں تو کہنے کو امی لقب ہے مگر
آگہی کا سمندر مدینے میں ہے
جسکی خوشبو سے مہکا ہے سارا جہاں
ایک ایسا گلِ تر مدینے میں ہے
جو گیا لے کے آیا نئی تازگی
وہ فضا روح پرور مدینے میں ہے
ہیں ابوبکر و فاروق و عثماں علی
یعنی ہر ایک رہبر مدینے میں ہے
دل میں شوق زیارت سوا ہے صفیؔ
نور و نکہت کا منظر مدینے میں ہے

اخلاقِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

علامہ شبلی نعمانیؒ

اس موقع پر یہ خیال پیدا ہوسکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ حسانؓ کو ممبر پر بٹھا کران کے اشعار سنتے تھے اور فرماتے تھے، اللّٰھم ایدہ بروح القدس حالانکہ یہ اشعار آنحضرت ﷺ کی مدح میں ہوتے تھے لیکن واقعہ یہ ہے کہ حسانؓ کے اشعار کفار کے مطاعن کا جواب تھا، عرب میں شعرا کو یہ رتبہ حاصل تھا کہ زورِ کلام سے جس شخص کو چاہتے ذلیل اور جس کو چاہتے معزز کر دیتے، ابن الزبعری اور کعب اشرف وغیرہ نے اس طریقہ سے آنحضرت ﷺ کو ضرر پہنچانا چاہا تھا، حسانؓ کی مداحی ان کا ردِ عمل تھا۔

سادگی اور بے تکلفی: معمول تھا کہ مجلس سے اٹھ کر گھر میں تشریف لے جاتے تو کبھی کبھی ننگے پاؤں چلے جاتے اور جوتی وہیں چھوڑ جاتے، یہ اس بات کی علامت تھی کہ پھر واپس تشریف لائیں گے۔

روز روز کنگھا کرنا ناپسند فرماتے، ارشاد تھا کہ ایک دن بیچ دے کر کنگھا کرنا چاہئے۔

(کھانے پینے، پہننے اوڑھنے، اٹھنے بیٹھنے، کسی چیز میں تکلف نہ تھا، کھانے میں جو سامنے آتا تناول فرماتے، پہننے کو موٹا جھوٹا جو مل جاتا پہن لیتے، زمین پر، چٹائی پر، فرش پر، جہاں جگہ ملتی بیٹھ جاتے۔ آپ ﷺ کے لیے آٹے کی بھوسی کبھی صاف نہیں کی جاتی تھی کرتہ کا تکمہ اکثر کھلا رکھتے تھے، لباس میں نمائش کو ناپسند فرماتے تھے، سامانِ آرائش سے آپ طبعاً نفور تھے غرض ہر چیز میں سادگی اور بے تکلفی پسند خاطر تھی۔)

امارت پسندی سے اجتناب: اسلام رہبانیت اور ان کا سخت مخالف ہے لا رھبانیة فی الاسلام اسی بنا پر آپ ﷺ ہر قسم کے جائز حظوظِ دنیوی سے متمتع ہونا جائز رکھتے تھے اور خود بھی کبھی کبھی ان چیزوں سے تمتع اٹھاتے تھے، تاہم ناز و نعمت تکلف و عیش پرستی کو ناپسند فرماتے اور اوروں کو بھی اس سے روکتے۔

ایک دفعہ ایک شخص نے حضرت علیؓ کی دعوت کی اور کھانا پکوا کو گھر بھیج دیا، حضرت فاطمہؓ زہرا نے کہا کہ رسول اللہ بھی تشریف لاتے اور ہمارے ساتھ کھاتے تو خوب ہوتا، حضرت علیؓ گئے اور آپ سے جا کر عرض کی، آپ ﷺ تشریف لائے لیکن دروازے پر پہنچے تو یہ دیکھ کر کہ گھر میں دیواروں پر پردے لٹکے ہوئے ہیں واپس چلے گئے (حضرت علیؓ نے واپسی کی وجہ دریافت کی، تو فرمایا پیغمبر کی شان کے خلاف ہے کہ وہ کسی زیب و زینت کے مکان میں داخل ہو)

فرمایا کرتے کہ گھر میں ایک بستر اپنے لئے، ایک بیوی کے لئے اور ایک مہمان کے لئے کافی ہے، چوتھا شیطان کا حصہ ہے۔

ایک دفعہ کسی غزوہ میں تشریف لے گئے، حضرت عائشہؓ رہ گئیں، لڑائی سے واپس تشریف لائے اور حضرت عائشہؓ کے پاس آئے تو دیکھا کہ گھر میں چھت گیر لگی ہوئی ہے، اسی وقت پھاڑ ڈالی اور فرمایا کہ خدا نے ہم کو دولت اس لئے نہیں دی کہ اینٹ کو پتھر کو کپڑے پہنائے جائیں۔

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی۔ 9838573645

دیباچوں میں ذکر شبلی کا مطالعہ

پروفیسر اختر الواسع

پروفیسر اختر الواسع (یکم ستمبر ۱۹۵۱ء) ہمارے عہد کے ہندوستان کے ممتاز دانشور ہیں، قدیم وجدید کے امتزاج کا ایک نمونہ ہیں، اور اس سلسلہ فکر کی کڑی ہیں جس کا سرا علامہ شبلی سے جا ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا پیمانہ عقیدت شبلی سے لبریز اور جذبات فکر شبلی سے سرشار ہیں، انھوں نے شبلی پر مضمون لکھا، دار المصنفین میں خطبہ دیا اور اپنی ادارت میں نکلنے والے مجلہ اسلام اور عصر جدید دہلی کا شبلی نمبر شائع کیا اور ایسا عمدہ خصوصی شمارہ شائع کیا کہ اسے برسوں تک یاد رکھا جائے گا اور حوالہ کا کام دے گا۔ اس کا انھوں نے جو حرف آغاز لکھا ہے اس کی سطر سطر سے عقیدت شبلی، فہم شبلی اور شبلی شناسی کا فراواں جذبہ نمایاں ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''شبلی نعمانی برصغیر ہند میں مسلمانوں کی تہذیبی وعلمی نشاۃ ثانیہ کے ایک ایسے نقش جمیل وجلیل ہیں جن سے صرف نظر کر کے ہندوستانی مسلمانوں کی گذشتہ ڈیڑھ سو سالہ تاریخ کی جو بھی شکل پیش کی جائے گی وہ نہ صرف نامکمل اور بے بضاعت ہوگی بلکہ استناد واعتبار سے بھی محروم ہوگی۔
> (حرف آغاز، اسلام اور عصر جدید، دہلی، شبلی نمبر ص ۵)

علامہ شبلی کے بارے میں اہل علم ودانش کا عام خیال ہے کہ وہ جامع کمالات تھے، پروفیسر اختر الواسع بھی ان کی جامعیت اور ہمہ جہتی کے معترف ومداح ہیں، وہ لکھتے ہیں:

> ''ہمہ جہت اور کثیر الابعاد ہونا ایک ایسا وصف ہے جسے انیسویں اور بیسویں صدی کی کئی علمی وتہذیبی شخصیتوں کا نشان امتیاز کہا جا سکتا ہے، مگر یہ وصف جس جس انداز سے شبلی کے یہاں ظاہر ہوا ہے اس کا رنگ ہی کچھ اور ہے''۔ (ایضاً ص ۶)

تصانیف شبلی کی اہمیت اور انفرادیت اب ہماری علمی وادبی تاریخ کا مسلمہ واقعہ ہے۔ پروفیسر اختر الواسع نے ان کی تصانیف کا کس انداز سے ذکر کیا ہے، ملاحظہ ہو:

> ''انھیں معروف طور پر مورخ اور سیرت نگار اور اس کے ساتھ ایک ادبی نقاد کی حیثیت سے تسلیم کیا جاتا ہے کہ ان میدانوں میں انھوں نے ایسے کارنامے انجام دیئے جو اپنی مثال آپ ہو کر رہ گئے۔ الفاروق اور المامون اور ان سب سے بڑھ کر سیرت نبویؐ پر ان کی ضخیم تالیف ایک عالم سے خراج تحسین وصول کر چکی ہے۔ فارسی شعر وادب

کی تفہیم وتعبیر پر ان کی معرکتہ الآرا تالیف شعرالعجم اور اردو ادبی تنقید کے میدان میں موازنہ انیس ودبیر کی انفرادیت اور کلیدی اہمیت سے کسے انکار ہوسکتا ہے۔ شعرالعجم نے تو خود اہل ایران کو حیران وششدر کردیا تھا اور یہ بات ان کے فہم سے بالاتر تھی کہ ایک ایسا شخص جس نے نہ کبھی ایران کی سر زمین پر قدم رکھا ہو اور نہ فارسی زبان وادب کا زندہ ماحول نصیب رہا ہو اسے اہل زبان سے کوسوں دور رہ کر بھی اس زبان کے شعر وادب کا ایسا گہرا درک کس طرح حاصل ہوا''۔(ایضاص۶)

پروفیسر اختر الواسع نے شبلی کے ذہن کی جولانیوں پر بھی روشنی ڈالی ہے، قدیم وجدید فکر ونظر سے ان کی گہری واقفیت، دینی علوم میں ان کی اجتہادی شان، ندوۃ العلما سے ان کی وابستگی کے اسباب وغیرہ کا ذکر بڑے خوبصورت اور مؤثر انداز میں کیا ہے، ان کا خیال ہے کہ

''سماجی اور عملی جد وجہد کے ضمن میں شبلی نعمانی کا ایک بڑا اجتہادی کارنامہ ان کی سیاسی فکر کی صورت میں سامنے آیا، جس نے بیسویں صدی کی اولین دو دہائیوں کے دوران مسلمانوں کے سیاسی رویوں اور ترجیحات کی تشکیل میں نہایت اہم کردار ادا کیا''۔(ایضاص۷)

شبلی کے قیام علی گڑھ، سرسید سے استفادہ اور علی گڑھ کے ماحول سے اثر پذیری کا ذکر تمام اہل قلم کرتے ہیں مگر پروفیسر اختر الواسع نے جس انداز سے تجزیہ کیا ہے وہ علی گڑھ تحریک اور شبلی کے ذہن وفکر پر ان کی گہری نظر کا پتہ دیتا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''سرسید کے افکار کی کشش شبلی کو علی گڑھ لائی، جہاں انھوں نے ۱۶ ربرس ایسے ماحول میں گذارے جو زبردست علمی تحقیق وتحریر کے ساتھ شدید عملی سرگرمیوں سے عبارت رہا ہے۔ اس پورے عرصے میں شبلی نعمانی کی تمام ذہنی صلاحتیں پوری کاملیت کے ساتھ بروئے کار نہ آتیں اگر انھیں سرسید کے افکار اور قربت سے وہ تحریک حاصل نہ ہوئی ہوتی جو علی گڑھ کے قیام کے دوران ان کے حصے میں آئی۔ اس تحریک نے شبلی کی خداداد قوتوں میں ایسی دھار پیدا کردی جس کی زد میں خود سرسید کے بہت سے افکار اور سرگرمیاں بھی آگئیں، مگر اس کے باوجود دونوں عبقریوں کے درمیان ایک دوسرے کے لئے احترام کا رشتہ بے داغ رہا''۔(ایضاص۷)

ان کا یہ بھی خیال ہے کہ

''سرسید ہی کی طرح شبلی بھی اپنے مذہب اور اپنی قوم سے نہایت مخلصانہ اور شدید جذباتی وابستگی رکھتے تھے مگر دونوں ہی نے اس وابستگی کو علمی سطح پر انگیز کیا اور اسے ایک نظام فکر کے تحت لانے کی کوشش کی''۔ (ایضا)

علامہ شبلی کے بلند تاریخی شعور، اس کے ثمرات اور اس کے فوائد خاص طور پر الفاروق اور سیرۃ النبیؐ کے بلند معیار کا ذکر و اعتراف عموماً کیا جاتا ہے، مگر علامہ شبلی کے اس لازوال طرز فکر اور سیرۃ النبی وغیرہ کی تصنیف کے پس پشت کیا مقاصد تھے اس کا ذکر اس انداز سے نہیں کیا جاتا جو ان کے شدید جذبات اور تخیل نے پیدا کئے تھے۔ پروفیسر اختر الواسع لکھتے ہیں:

''شبلی نے ایک مورخ اور سیرت نگار کا کردار ادا کرنے کا فیصلہ کیا اور ایک کے بعد ایک الفاروق اور المامون جیسی تحریریں پیش کیں، جنھوں نے مسلمانوں کو ان کے ماضی کی تابناک روشنیوں کے روبرو کیا اور فکر وخیال کا ایک نیا افق منور کیا۔ سیرت نگاری کے اس سلسلے کا نقطہ عروج بلا شبہہ سیرۃ النبیؐ کی تالیف ہے۔ جو تاریخی تحقیق، واقعات کی ترتیب اور طرز تحریر ہر لحاظ سے سیرت طیبہ کی علمی پیش کش کا ناقابل عبور معیار بن گئی ہے۔ شبلی نے تاریخ نگاری کا فن کچھ تو اپنے ماضی کی علمی روایت سے سیکھا اور کچھ اپنے زمانے کے فن تاریخ کے مطالعے سے اور اس پر اپنی فطری ذہانت کے اضافے سے ایک ایسا طرز نکالا جس میں علمی صلابت بھی تھی اور ادبی شان بھی۔ سیرۃ النبیؐ کو آج بھی اپنے موضوع پر ایسی رہنما تحریر تصور کیا جاتا ہے جس پر اضافہ کرنے کی کوئی بھی کوشش اسے نظر انداز یا مسترد کر کے آگے نہیں بڑھ سکتی''۔(ایضاص۹)

علامہ شبلی کی زندگی کا ایک بڑا کارنامہ مستشرقین کے کذب وافترا کا پردہ چاک کرنا اور نہایت بلند علمی و تحقیقی معیار پر ان کے اعتراضات کا جواب دینا بھی ہے۔ پروفیسر اختر الواسع نے شبلی کی اس سلسلہ کی خدمات کا بھی ذکر کیا ہے اور اسے زندہ حقیقت سے تعبیر کیا ہے۔ فلسفہ وکلام کے میدان میں شبلی کی انفرادیت بھی بیان کی ہے۔ ان کی ماضی پرستی اور اس پر تنقید کی بھی وضاحت کی ہے اور اپنے موقف کی تائید میں شبلی کی تحریروں کے اقتباسات بھی نقل کئے۔

ان کا یہ بھی خیال ہے کہ شبلی نے جدید وقدیم خیالات کے حاملین میں مفاہمت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، جذبات کو مشتعل نہیں کیا ہے، تعلیم کے متعلق شبلی کے خیالات کی توضیح کے بعد خواتین کی تعلیم کے بارے میں شبلی کے نقطہ نظر پر روشنی ڈالی ہے اور لکھا ہے کہ

''شبلی شاید اپنے زمانے کے واحد عالم دین ہیں جنھوں نے اس شد و مد اور سنجیدگی کے ساتھ مسلم عورتوں میں تعلیم کو فروغ دینے اور ان میں روشن فکری پیدا کرنے کی وکالت کی۔ ان کے نزدیک خواتین کو بے تعلیم رکھنا مسلمانوں کے اجتماعی وجود کے نصف حصے کو تاریکی میں رکھنے کے مترادف تھا۔ وہ اس معاملے میں مردوں اور عورتوں میں کسی قسم کے امتیاز کے قائل نہیں تھے''۔ (ایضاص۱۳)

پروفیسر اختر الواسع نے شبلی کی شخصیت اور افکار

ونظریات اوران کی علمی، ادبی، تاریخی اور تحقیقی کاوشوں کے تجزیہ کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ

''شبلی نعمانی حقیقی معنی میں ایک مجتہد اور عبقری تھے۔ جنھوں نے بہت سی راہیں روشن کیں اور پرانی راہوں میں نئے امکانات پیدا کئے''۔(ایضاص۱۴)

پروفیسر ظفر احمد صدیقی

پروفیسر ظفر احمد صدیقی (پ:۹رفروری ۱۹۵۳ء) اردو کے ممتاز اہل قلم اور محقق ومصنف ہیں، بنارس ہندو یونیورسٹی کے بعد اب مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں پروفیسر ہیں، اردو زبان وادب پر ان کی گہری نگاہ ہے۔ متعدد کتابیں ان کے قلم سے نکل کر مقبول ہوچکی ہیں اور یہ بحمداللہ یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔

ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی کے پی ایچ ڈی کے مقالے کا موضوع علامہ شبلی حیات اور کارنامے تھا، چونکہ وہ بھی سر زمین شبلی ہی کے لعل ہیں، اس لئے شبلی سے فطری طور پر لگاؤ تھا، ندوہ میں تعلیمی وابستگی نے اس میں اور جلا بخشی ہوگی، بہرحال ریسرچ کے زمانہ سے آج تک انھوں نے شبلی پر متعدد مقالات سپرد قلم کئے اور چار کتابیں مولانا شبلی بحیثیت سیرت نگار، شبلی کی علمی وادبی خدمات، شبلی مونوگراف اور شبلی شناسی کے اولین نقوش، شائع ہوچکی ہیں۔

پروفیسر ظفر احمد صدیقی نے ایک محقق ومصنف اور نقاد کی طرح شبلی کی عظمت بھی بیان کی ہے اوران پر نقد بھی کیا ہے۔ ان کے مطالعے کا یہ موقع نہیں کہ ان صفحات میں صرف مقدمات کے اندراجات سے بحث مقصود ہے۔ لیکن افسوس کہ صدیقی صاحب کی اول الذکر تینوں کتابیں ہمارے موضوع سے باہراور چوتھی کتاب پر انھوں نے محض دو صفحے کا دیباچہ لکھا ہے، تاہم مقدمہ کا درج ذیل اقتباس ان کے نزدیک عظمت شبلی کا پتہ دیتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''پیش نظر کتاب......ان تحریروں پر مشتمل ہے جو شبلی شناسی کی اولین روایات کا حصہ ہیں۔ اس کی قدر وقیمت کا اندازہ اس کے مشتملات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ ان تحریروں کی جمع وترتیب کے دوران علامہ شبلی کی یہ امتیازی شان کھل کر سامنے آئی کہ انھوں نے اپنی شخصیت کی دلکش ودلآویزی نیز کمالات فن کے لحاظ سے اپنے ہم عصروں اور ہم نفسوں کو سب سے زیادہ متوجہ کیا۔ ان کی عظمت کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ گذشتہ ایک صدی سے بہ کثرت اور متنوع پہلوؤں سے ان پر لکھے جانے کے باوجود یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہ موضوع اپنے امکانات ختم کرچکا ہے۔ بلکہ ان سے متعلق تحریر وتسوید کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ اور ہر نئی نسل انھیں اپنے انداز سے پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ بقول اقبال:

کیفیت باقی پرانے کوہ وصحرا میں نہیں
ہے جنوں تیرا نیا پیدا نیا ویرانہ کر

(شبلی شناسی کے اولین نقوش، ابتدائیہ ص۱۳)

مولانا حبیب الرحمن۔حیدرآباد

نجات کا اٹل قانون

سال، مہینے، دن ورات کے متعلق فرمایا گیا

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِندَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَا اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ (التوبہ ۳۶) ”بے شک مہینوں کی گنتی اللہ کے پاس کتاب اللہ میں (صرف) بارہ (ہی) ہے، اُس دن سے جب سے آسمان اور زمین کو اس نے پیدا کیا ہے، ان میں سے چار مہینے حرام (ادب کے) ہیں، یہی مظبوط دین ہے“

اس سے ثابت ہوا کہ ان میں سے نہ کوئی منحوس ہے اور نہ کوئی برکت کا۔ تو لازماً ماہ، دن ورات، ساعت بھی منحوس ومبارک نہیں ہوسکتے۔ نحوست وبرکت کے غلط عقائد میں شیطان بنی آدم کو مبتلا کر کے گمراہ کرتا آیا ہے۔ اس لئے اس کے فریب سے بچنے کے لئے فرمایا گیا اَلنَّسِیٓءُ زِيَادَةٌ فِی الْكُفْرِ (التوبہ ۳۷) ”اس کے سواء کچھ نہیں کہ مہینوں کا آگے پیچھے کر لینا کفر میں زیادتی ہے“ یعنی خاص کو عام اور عام کو خاص کر لینا۔

نبی ﷺ کی ایک زوجہ مطہرہ ہمیشہ جمعہ ہی کو روزہ رکھا کرتی تھیں تو نبی ﷺ نے روزہ توڑنے کا حکم دیتے ہوئے تاکیداً فرمایا کہ جمعہ کے دن اور رات کو ہفتہ کے دوسرے دن اور رات پر فضیلت مت دو (صحیح بخاری، کتاب الصوم، صحیح مسلم، کتاب الصیام)

رمضان کے مہینہ میں کئے ہوئے اعمال کا بدلہ دوسرے مہینوں میں کئے ہوئے اعمال سے زیادہ ملنے کی بات، قرآن کے خلاف ہے، کیونکہ بیمار ومسافر کو رمضان کے روزوں کی گنتی کو دوسرے مہینوں میں روزہ رکھ کر پوری کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ حکم دو مرتبہ دیا ہے۔ (سورہ البقرہ ۱۸۴، ۱۸۵)

اللہ کا اٹل قانون یہی ہے کہ گزرا ہوا وقت قیامت تک واپس نہیں آسکتا۔ چنانچہ سبھی مانتے ہیں کہ ان کی تاریخ پیدائش قیامت تک واپس نہیں آسکتی۔ لیکن جہالت کی انتہاء یہ ہے کہ شبِ معراج، شبِ برأت اور شبِ قدر کے ہر سال آنے کو مانتے ہیں روزہ رکھتے ہیں اور رات بھر جاگتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ایسا کرنے سے بڑا ثواب ملتا ہے۔ تیسرے بنی آدم کی آزمائش وامتحان کے لئے کائنات کی ہر چیز کا یکساں ہونا ضروری ہے تا کہ انسان ان کو صحیح یا غلط طریقہ سے استعمال کر کے اپنے لئے مبارک یا

منحوس بنائے۔ چوتھے ایک ہی چیز غلط استعمال سے نقصان دہ ہوتی ہے اور وہی چیز صحیح طریقہ پر استعمال کرنے سے فائدہ مند ہوتی ہے۔ پانچویں کسی چیز میں فی الواقع نحوست یا برکت ہوتی تو بارش یا سیلاب وغیرہ کی طرح تمام انسان متاثر ہوتے۔

دعاء

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِيٓ أَسْتَجِبْ لَكُمْ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ (مومن) ''اے انسانو! تمہارا پروردگار فرماتا ہے کہ تم مجھے پکارو(مجھ ہی سے دعا کرو) میں ہی تمہاری دعائیں قبول کرتا ہوں اور بے شک جو میری عبادت (میری ہدایت کے مطابق مجھ ہی سے دعا) نہیں کرتے تکبر کرتے ہیں، وہ (یقیناً) ذلیل وخوار ہوکر جہنم میں داخل کئے جائیں گے''

بندوں کے لئے دعا کرنے کا صحیح طریقہ یہ بتایا گیا کہ وہ راست رب کو ہی پکاریں اور اس سے دعا کریں کیونکہ رب ہی ہماری دعاؤں کو قبول کرسکتا ہے، اس کے سوا کوئی اور نہیں، کیونکہ کائنات میں صرف اسی کی فرمانروائی ہے اس کے سوا کسی اور کی نہیں۔ اس تاکیدی ہدایت کے خلاف جو لوگ اللہ کو چھوڑ کر یا اللہ کے ساتھ پیر' پیغمبر کو پکارتے ہیں یا دعاؤں میں ان کا واسطہ وسیلہ لیتے ہیں ان کے متعلق فرمایا

قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّي لَوْلَا دُعَاؤُكُمْ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُونُ لِزَامًا (الفرقان) ''اے نبی! کہو کہ میرا رب تمہاری ذرا بھی پرواہ نہیں کرتا اگر تم اس کو (اس کے بتائے ہوئے طریقے سے) نہ پکاروگے (یعنی اس کے بتائے ہوئے طریقے سے اس سے دعا نہ کروگے) ، پس تم (اس بات کو) جھٹلاتے ہو (کہ جو پیدا کیا وہی دعا قبول کرتا ہے) تو عنقریب اس کی سزا تم کو چمٹ جانے والی ہوگی''

بندہ دعا ہی کے ذریعہ راست اپنے رب سے جڑتا ہے، اس لئے اللہ کے رسول نے فرمایا الدعاء مخ العبادۃ ''دعاء عبادت کا مغز ہے'' الدعاء ھو العبادۃ ''دعاء ہی عبادت کی اصل ہے'' انابت الی اللہ ''اللہ کی طرف رجوع ہونا'' رجوع وعبادت کا واحد طریقہ دعا ہی ہے۔ غور کیجئے دنیا میں کوئی بھی دوسرے سے یہ نہیں کہتا کہ میرے لئے نماز پڑھئے، میرے لئے روزہ رکھئے، لیکن میرے لئے دعا کیجئے یا دعاؤں میں یاد رکھئے کہہ کر اپنے دیندار ہونے کا اظہار کرتا ہے، حالانکہ وہ جانتا ہے کہ اس کا رب اس کی شہہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے (ق ۱۶) ایک بچہ کسی سے بھی یہ نہیں کہتا کہ آپ میرے لئے میری ماں سے کہئے۔ لیکن دوسروں سے اپنے لئے دعا کرنے کی بات کہنے والا' بچہ سے بھی زیادہ گیا گزرا ہے۔ کیونکہ بچہ یقین رکھتا ہے کہ اس کی ماں اس کی بات ضرور سننے والی ہے۔ لیکن دوسروں سے دعا کروانے والا اپنے رب سے بدگمانی کا شکار ہے کہ دوسروں سے دعا کروائے بغیر اس کا رب اس کی دعا قبول نہیں کرتا۔

(قسط:۱)

مولانا انصار احمد معروفی۔پورہ معروف مئو(اتر پردیش)

کتاب ’’شبلی شناسی کے سو سال‘‘: میری نظر میں

علامہ شبلی (۱۸۵۷ء۔۱۹۱۴ء) کی شخصیت اور ان کے کارناموں کا اگر مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی حکمت اور اس کی قدرت کاملہ کا ظہور ہے کہ وہ کبھی کبھی ایک ہی انسان میں کئی انسانوں کی خوبیاں، اور ایک ہی شخصیت میں کئی شخصیات کے کارناموں کو جمع کر دیتا ہے، اس طرح کہ ایک ہی شخصیت کے متعدد پہلو، اور ہر پہلو اپنے آپ میں مکمل ہونے کے ساتھ قابل فخر بھی۔ کیوں کہ علامہ شبلی نعمانی اگر ایک طرف جید عالم دین ہیں، جن کی نظر میں گہرائی و گیرائی ہے، تو دوسری جانب وہ اعلیٰ پایہ کے محقق بھی ہیں، تصنیف و تالیف کی علمی خوبیاں اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں تو وہیں صاحب بصیرت کے ثبوت کے طور پر بہترین نقاد بھی ہیں، اگر وہ اپنی سوانحی تصنیفات کی وجہ سے مؤرخ ہیں تو بحر فلسفہ و علم کلام کے ماہر تیراک بھی ہیں، نثر میں اپنے جدید اسلوب نگارش کی وجہ سے اگر وہ قابل تقلید انشا پرداز ہیں تو نظم میں حسن بیان، شگفتگی، اعجاز بیانی، اور فکر وخیال کی بلندی کی بنا پر بہت اونچے شاعر اور نظم نگار بھی ہیں۔ اسی کے ساتھ اردو کے علاوہ صاحب زبان کی طرح عربی اور فارسی پر مکمل عبور بھی حاصل ہے، سیاسی شعور رکھنے کی وجہ سے ملک وقوم کی بہترین رہنمائی میں بھی ان کا اعلیٰ مقام ہے، ملک کے مسلمانوں میں تعلیمی بیداری کے تئیں جدید وقدیم تعلیم کا شعور بیدار کرنے میں بھی ان کی خدمات قابل قدر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی وفات پر ایک سو سال سے زیادہ کا زمانہ گزرنے کے بعد آج بھی شبلی شناسی کا عمل جاری ہے، اور ان کے علمی و تاریخی کارناموں کا ملک اور بیرون ملک میں چرچا عام ہے، ان کی کتابوں کے ترجمے دوسری زندہ اور عالمگیر زبانوں میں ہو رہے ہیں اور رفتہ رفتہ شبلی شناسی کی راہیں مزید ہموار اور وسیع ہو رہی ہیں۔ اچھی تحریریں ہمیشہ زندہ رہتی ہیں، یہ ادبی تحریریں مرور زمانہ کی وجہ سے فرسودہ اور پامال نہیں ہوتیں۔ بلکہ بعد کے دور میں اس کی قدر اور بڑھ جاتی ہے اور اس کے حسن و خوبی کے نئے نئے پہلو اور گوشے اجاگر کیے جاتے ہیں۔

علامہ شبلی کی وفات پر ایک صدی سے زیادہ کا لمبا زمانہ گزر چکا ہے، لیکن اب بھی ان کے کارناموں کی نہ صرف چمک دمک برقرار ہے، بلکہ اس کی تابانی میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے، اور ان کے علمی، ادبی، تاریخی اور تحقیقی کارناموں کے خدو خال مزید نمایاں اور روشن ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ شبلی شناسی کے تعلق سے اگر موجودہ دور کے مصنفین وقلم کاروں کا جائزہ لیا جائے تو ان میں نمایاں طور پر علامہ شبلی کے دیار سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کا نام سب سے پہلے سامنے آئے گا، حالانکہ ان سے قبل بہت سے اہل قلم نے علامہ شبلی کی خدمات کو اجاگر کیا ہے، اور ان کی خدمات قابل ستائش ہونے کے ساتھ بعد کے لوگوں کے لیے مستند اور نقش اولین کی حیثیت رکھتے ہیں، جس کا ثبوت ’’حیات شبلی‘‘ رسائل و جرائد کے خصوصی نمبرات اور شبلیات سے متعلق بہت سی کتابیں اور مقالات ہیں۔ لیکن ادھر گذشتہ کئی سال سے ڈاکٹر الیاس صاحب نے شبلی وافکار شبلی و خدمات شبلی کو اپنی تحقیق کا موضوع بنا کر جب سے کام شروع کیا ہے تب سے شبلی کی خدمات و کارنامے کے مختلف گوشے اور کتابیں شائع ہو کر سامنے آ رہی ہیں۔ انہوں نے نہایت خلوص اور دلجمعی سے شبلی سے متعلق کام کیا ہے، جس پر اہل علم کی جانب

سے انہیں مبارکباد پیش کی جارہی ہے، اور ان کے کام کی ہر طرف ستائش ہورہی ہے ۔ ان کے محققانہ انداز اور تنقیدی بصیرتوں کی تعریف کی جارہی ہے۔ پروفیسر عبدالستار دلوی نے لکھا ہے "ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی اپنی نگارشات سے اردو زبان و ادب اور شبلی اور دبستان شبلی کی خدمت میں ایک عرصہ سے مسلسل مصروف ہیں۔ انہوں نے شبلی سے متعلق جو بھی کام کیا ہے وہ محنت، دلجمعی اور سنجیدگی سے کیا ہے، اس میں فکر کی گہرائی بھی ہے اور خلوص کی گرمی بھی ۔ ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی نے متعلقات شبلی، کتابیات شبلی، شبلی سخنوروں کی نظر میں، مکتوبات شبلی شبلی کے نام اہل علم کے خطوط اور آثار شبلی تحریر کر کے شبلیات کے ذخیرے میں گراں قدر اضافہ اور "ماہر شبلیات" کا درجہ حاصل کرلیا ہے"۔ شبلی شناسی کے سو سال۔ آخری صفحہ کی پشت پر۔

۱۸ ر نومبر ۲۰۱۴ء کو شبلی کی وفات پر ایک سو سال پورے ہوئے، اس دوران علامہ شبلی کی جامع کمال شخصیت اور علم و ادب کے میدان میں ان کی ہمہ جہت خدمات کی وجہ سے شبلی سے متعلق بہت سی کتابیں اور رسالوں کے خصوصی نمبرات شائع ہوئے، جس کا سلسلہ ان کی وفات سے شروع ہو کر آج بھی قائم ہے۔ لیکن "شبلی شناسی کے سو سال" کتاب؛ جو ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کی تحریر کردہ کتاب (۲۰۱۴ء) ہے، اس کتاب میں شبلی سناسی سے متعلق صرف رسالوں کے خصوصی نمبرات کا جائزہ لیا گیا ہے ۔ اردو ادب کے فروغ میں مجلات و رسائل کا کردار ناقابل فراموش ہے، ان رسائل کی وجہ سے ادب کی سمت و رفتار، نیز ادبی شخصیات کے مضامین اور وفات پانے والی ادبی شخصیات کے متعلق خدمات سے ہم واقف ہو پاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ بہت سے رسائل مشہور شخصیات کی وفات پر ان کے علمی کارناموں کو اجاگر کرنے کے لیے نمبرات یا کم از کم کوئی گوشہ ہی شائع کر کے انہیں خراج عقیدت پیش کیا کرتے ہیں۔

علامہ شبلی کی وفات حسرت آیات پر بہت سی کتابیں اور گراں قدر مضامین اور خاکے شائع ہوئے، جو متعدد رسالوں میں منتشر ہیں، ان کی وفات پر اظہار غم میں نہ جانے کتنے تاریخی قطعات اور اشعار کہے گئے ہیں، جن تک رسائی بہت دشوار ہے، لیکن رسالوں کے نمبرات جو شبلی کی وفات کے بعد ان پر شائع ہوئے، جن پر ایک صدی سے زیادہ کا زمانہ گزر گیا ہو، ان کی تلاش و جستجو کوئی آسان کام نہیں تھا، یہ کام وہی سیماب صفت شخصیت ہی کر سکتی ہے، جس کے اندر علم کی تحقیق و جستجو کا شوق اور علمی لگن ہو، جسے شبلی کی خدمات سے شغف اور اور خود شبلی سے عقیدت و محبت ہو۔ کیونکہ رسائل کا پتہ لگانا کہ کس رسالہ نے شبلی سے متعلق کوئی نمبر نکالا ہے؟ وہ کہاں سے شائع ہوتا تھا؟ ابھی فی الحال وہ زندہ ہے یا دیگر رسائل کی طرح جلد ہی مرحوم ہو گیا؟ اس رسالہ تک رسائی کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟ کس سے رابطہ کیا جا سکتا ہے جو ان کو دستیاب کرانے میں مدد کر سکے؟ معلوم ہوا کہ ان میں کے اکثر رسالے اس وقت بند ہو گئے ہیں، اور پھر کئی رسالے دوسرے ملک کے تھے، مگر ہمت اور لگن ہو تو کام آسان ہو جاتا ہے۔ پھر بھی کچھ رسالے انہیں نہیں مل سکے، ڈاکٹر محمد الیاس لکھتے ہیں "گذشتہ تقریباً ۱۰۰ سال کے درمیان ہندو پاک کے جن رسائل کے شبلی نمبر نکلے، ان میں اب بیشتر کم یاب بلکہ نایاب ہیں، ماہنامہ "خاور" ڈھاکا، اور ماہنامہ "درس" علی گڑھ کے "شبلی نمبر" اب تک دستیاب نہ ہو سکے۔" "شبلی شناسی کے سو سال"۔ ص ۱۴۔

اس کتاب میں الاعظمی نے ایک درجن رسائل کے شبلی نمبر کا جائزہ لیا ہے اور تفصیل سے ان رسائل کے بارے میں معلومات فراہم کی ہے کہ وہ رسالہ کب اور کہاں سے جاری ہوا؟ اس کے مدیر کون تھے؟ مجلس ادارت میں کون کون لوگ شامل تھے، اس میں کس کس کا مضمون شائع ہوا؟ مضامین کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے، ساتھ ہی مضمون کے حسن و قبح اور اعتراض کا جواب بھی شامل کتاب کیا گیا ہے ۔ اس میں محمد الیاس نے کوشش کی ہے کہ علامہ شبلی پر جو اعتراضات قائم کیے گئے ہیں ان کا علمی جواب دیا جائے اور شبلی کا دفاع کیا جائے۔

چنانچہ الیاس صاحب نے لکھا ہے ''کوشش کی گئی ہے کہ ان میں شامل مضامین و مقالات کا بھر پور تعارف و تجزیہ اور ان کے مشمولات کامکمل ذکر آجائے، اور مقالہ نگاروں نے جن بنیادی خیالات کا اظہار کیا ہے ان کا ذکرانہی کے الفاظ میں پیش کر دیا جائے، یہ بھی کوشش کی گئی ہے کہ جن مقالات میں موضوع کا حق ادانہیں ہوا ہے، یا جو کمیاں رہ گئی ہیں ان کی نشاندہی کر دی جائے ''۔حوالہ بالا۔ص ۱۲۔ ہر رسالہ کے سرورق کا فوٹو بھی زینت کتاب بنایا گیا ہے۔ڈاکٹر محمد الیاس کی کتاب کی ایک خوبی یہ دیکھی جاتی ہے کہ وہ موضوع کے اعتبار سے کتاب کا حق ادا کرنے کی جہد مسلسل کرتے ہیں، کوئی گوشہ تشنہ نہیں چھوڑنا نہیں چاہتے، بالخصوص شخصیات کے کالم میں کوئی نام ایسا نہیں پیش کرتے جس کی تاریخ پیدائش اور وفات کا ذکر نہ ہو۔ اگر وہ مرحوم ہو چکے ہوتے ہیں۔ یہی حال ان کی پیش کردہ اقتباسات کا ہوتا ہے وہ اپنے اقتباس کے ماخذ کی نشاندہی ضرور کر دیا کرتے ہیں۔ اس کی وجہ سے کتاب باوقعت اور مستند ہو جاتی ہے۔

کتاب میں محمد الیاس صاحب نے سب سے پہلے جناب پروفیسر اختر الواسع کا دیباچہ ذکر کیا ہے، جو علامہ شبلی سے ایک خاص لگاؤ اور محبت رکھتے ہیں، پھر حرف آغاز کے طور پر الیاس صاحب نے کتاب سے متعلق اپنی بات چھ صفحہ میں رکھی ہے۔ پھر انہوں نے تقریبا چالیس صفحات پر مشتمل شبلی شناسی سے متعلق ان تمام کارکردگیوں کا جائزہ پیش کیا ہے جواب تک شبلی کے تعلق سے ہوئیں۔ مثلاً تحریر و تقریر، سیمینار، جلسے، ان پر ہفتہ اور ڈے منانا، ان سے متعلق کوئی یادگار قائم کرنا، اسکول و کالج، روڈ، اکیڈمیاں قائم کرنا، یا ''ڈے'' منانا، کتب خانے اور کسی علمی یادگار کا قائم کرنا وغیرہ وغیرہ کا تفصیلی جائزہ لیا ہے، جو بہت اہم اور قابل مطالعہ ہے، اسے محمد الیاس صاحب نے بڑی عرق ریزی سے تیار کیا ہے۔ شبلی شناسی کے اس مطالعہ میں ان کو ارباب حکومت اور مذہبی انجمنوں سے شکایت ہے کہ ''

آزادی کے بعد حکومت کی سطح پر علامہ شبلی کو کبھی یاد نہیں کیا گیا، شعبۂ مطالعات شبلی'' اور ''شبلی چیئر'' تو دور، ایک ڈاک ٹکٹ بھی جاری نہیں کیا گیا قومی سیاست میں نظریاتی اعتبار سے ہم آہنگی (علامہ شبلی کانگریس کے حامی اور مسلم لیگ کے مخالف تھے) کے باوجود جمعیۃ علما نے شاید ہی کہیں ان کا نام لیا ہو''۔ البتہ اہل علم و کمال اور دانشوروں نے شبلی اور فکر شبلی سے ہمیشہ سروکار رکھا، آج شبلی شناسی کا جو سرمایہ ہمارے پاس ہے وہ انہی دانشمندوں کا رہین منت ہے''۔بالا۔ص ۵۶۔

رسائل و جرائد کا پہلا شبلی نمبر ۱۹۳۰ء میں ماہنامہ خضر راہ '' لکھنؤ نے نکالا جس کے مدیر حامد ندوی تھے۔ اور آخری نمبر رسالہ ''سہ ماہی اسلام اور عصر جدید'' دہلی کا ہے، جس نے ۲۰۰۸ء میں شبلی نمبر شائع کیا۔ ماہنامہ خضر راہ'' کے اس شمارہ کے بارے میں انہوں نے لکھا ہے '' یہ شبلی نمبر کئی لحاظ سے منفرد اور وقیع ہے، اس میں جو مضامین و مقالات شامل ہیں، وہ شبلی کے احباب، معاصرین اور تلامذہ کے قلم سے ہیں، صرف ایک مضمون نگار اس زمرہ سے علاحدہ ہیں اور وہ ''سودیشی ریل کے مصنف شوکت تھانوی (۱۹۰۴ء۔۱۹۶۳ء) ہیں۔ص ۵۹۔

اس شبلی نمبر کے لیے جن مقالہ نگاروں نے مضامین تحریر کیے ان کی تعداد پندرہ ہے۔ مضامین میں تنوع ہے، اور تمام اہل قلم نے شبلی پر گراں قدر مقالے لکھے، علامہ سید سلیمان ندوی نے حجۃ الملۃ والدین حضرت شبلی نعمانی کے عنوان سے لکھا۔ جس کے بارے میں الیاس صاحب نے وضاحت کی ہے کہ '' اس میں علامہ شبلی نعمانی کی جامع کمال شخصیت کا ایک عمدہ مگر اجمالی مرقع آگیا ہے۔ اور شاید ہی کوئی پہلو رہ گیا ہو'' ص ۶۴۔ شبلی کی کتاب ''سیرۃ النعمان'' ہے اس کے متعلق ہمدم و ہمت کے ایڈیٹر سید جالب دہلوی نے مقالہ تحریر کیا ہے '' مرحوم مولانا حالی نے (مسدس حالی میں) گذشتہ دور عظمت کی طرف صرف معنی خیز اشارات کیے ہیں اور علامہ شبلی نعمانی نے اس دور کی علمی ترقیوں کا پورا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ اور تاریخ اسلام کی وہ عظیم

الشان خدمت انجام دی ہے جس کے شکر و احسان سے ایک طرف مسلمان اور دوسری طرف زبان اردو کبھی سبک دوش نہیں ہوسکتی۔ص ۶۵۔

تحریک اصلاح اور علامہ شبلی کے عنوان سے مولانا ابوالکلام آزاد نے مقالہ لکھا ہے۔جس کی بابت محمد الیاس نے تحریر کیا ہے کہ" یہ مقالہ اصلا علامہ شبلی کے مخالفین کے جواب میں لکھا گیا ہے۔انہوں نے ندوہ کے لیے مولانا شبلی کی بیشتر کوششوں اور کاوشوں کا ذکر بھی کیا ہے اور ایسی عمدگی سے کیا ہے کہ ندوہ کے سلسلے کے تمام اہم کارنامے سامنے آجاتے ہیں"۔ ص ۶۵۔اس پہلے اور اہم نمبر کے دیگر قلم کاروں میں ملا رموزی، مولانا عبدالسلام ندوی، ایم مہدی حسن افادی، مولانا محبّ اللہ لاری، شوکت تھانوی، مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی۔سید رئیس احمد جعفری، مولانا ابوالبقا، مشیر احمد علوی، حکیم سید عبدالعلی اور مدیر رسالہ حامد ندوی شامل ہیں۔ان میں مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی نے علامہ شبلی کی "قومی خدمات" کے عنوان سے شبلی کی قومی خدمات کو اچھے انداز میں اجاگر کیا ہے، بہت سے لوگ شبلی کی ان اہم خدمات سے ناواقف ہیں، الیاس الاعظمی نے لکھا ہے کہ "علی گڑھ کالج کی ترقی میں علامہ شبلی کی خدمات، اعظم گڑھ میں نیشنل اسکول کا قیام، ندوہ کو ترقی سے ہم کنار کرنا، اشاعت اسلام کے سلسلے کی کاوشیں، اوقاف اسلامی اور وقف علی الاولاد کی جدوجہد، انگریزی ترجمۂ قرآن کی کوشش، صیغۂ اغلاط تاریخی کا قیام، تعطیل جمعہ کی تحریک، ورنا کیولر اسکیم کمیٹی میں شمولیت اور اردو کے لیے جدوجہد اور آخر میں دارالمصنفین کا قیام وغیرہ کی تمام تفصیلات مولانا ندوی نے قلم بند کر کے ثابت کیا ہے کہ علامہ شبلی کی قومی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے"۔ص ۷۱۔اس نمبر کے متعلق الیاس الاعظمی نے اپنا تاثر ان الفاظ میں ذکر کیا ہے "شبلی کی وفات کے بعد سب سے اہم کام جو منظر عام پر آیا وہ یہی "خضر راہ" کا شبلی نمبر تھا۔"حیات شبلی" اس کی اشاعت کے تیرہ سال بعد شائع ہوئی"۔ص ۷۳۔ماہنامہ خاور، ڈھاکہ۔۱۹۵۳ء کے شبلی نمبر کا پتہ لگنے کے ساتھ مصنف کتاب کو بسیار محنت کے باوجود اس کا نمبر دستیاب نہیں ہوسکا۔پھر مرتب کتاب نے ماہنامہ "صبا" حیدرآباد کے شبلی نمبر کا تذکرہ کیا ہے، جس نے ۱۹۵۷ء میں شبلی نمبر شائع کیا اس کے مدیر ادیب و شاعر سلیمان اریب تھے۔مرتب نے پہلے اس رسالہ کا تعارف کرایا، پھر بتایا کہ اس خاص نمبر میں کل آٹھ مضامین شامل ہیں، پہلا مضمون شبلی کی سوانح سے متعلق ہے، جسے زینت ساجدہ نے لکھا ہے، دوسرا مضمون بھی شبلی کی سوانح سے تعلق رکھتا ہے، جسے تمکین کاظمی نے تحریر کیا ہے، ان کے بارے میں الیاس صاحب نے یہ انکشاف کیا ہے کہ "انہوں نے فارسی کی ایک نظم ایسی نقل کی ہے جو کلیات شبلی میں بھی شامل نہیں ہے"۔ص ۷۶۔ادارہ ادبیات اردو کے بانی ڈاکٹر محی الدین قادری زور کا مضمون شامل ہے، جس کے متعلق الیاس صاحب لکھتے ہیں کہ انہوں نے "ادارہ ادبیات اردو میں محفوظ شبلی کی چند تحریروں کا تعارف کرایا ہے، ان کے مقالے کا عنوان ہے "شبلی کے بارے میں چند غیر مطبوعہ اطلاعات"۔اس کے بعد نصیر الدین ہاشمی کا مضمون "علامہ شبلی اور حیدرآباد" ہے۔اس کے بارے میں الیاس صاحب لکھتے ہیں کہ "شبلی کے حیدرآباد تعلق کی بیشتر تفصیلات اس میں آگئی ہیں، تاہم مضمون تشنہ معلوم ہوتا ہے، (کیونکہ) ناظم سررشتہ علوم وفنون کی حیثیت سے انہوں نے جو خدمات انجام دیں اس کا سرے سے ذکر نہیں"۔ص ۷۸۔اس کے علاوہ "علامہ شبلی نے انگریزی ترجمہ قرآن کی جو کوشش کی تھی ، اور جو معتبر ترجمہ قرآن کی پہلی کوشش تھی، اس کا تعلق بھی حیدر آباد کے ایک ذی علم نواب عماد الملک سید حسیب بل گرامی (۱۸۴۲-۱۹۲۶ء) سے تھا، اس مضمون میں اس کا ذکر بھی نہیں ہے۔ص ۷۹۔

پھر "اسلامی فکر کی تشکیل جدید میں شبلی کا حصہ" کے عنوان سے عالم خوندمیری نے مضمون لکھا ہے۔سرسید اور شبلی نے علم کلام کو موضوع بنایا ہوا ہے۔الیاس صاحب نے تجزیہ

کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ”سرسید کا کام نقش اول کی حیثیت رکھتا ہے، البتہ علامہ شبلی نے یہ کام منصوبہ بند طریقے سے کیا مگر انہیں بھی خاطر خواہ کامیابیاں نہیں ملی۔ عالم خوندمیری کا خیال ہے کہ دونوں کے نقطۂ نظر میں کوئی اختلاف نہیں ہے“۔۔۔۔۔ پھر آگے چل کر عالم صاحب لکھتے ہیں ”سرسید اور شبلی کے باہمی اختلافات کو بعد کی نسل میں بدقسمتی سے شبلی کے بعض بڑے وفادار لیکن دراصل ناخلف شاگردوں نے بڑے مبالغہ آمیز انداز میں پیش کیا“۔ اس پر الیاس صاحب نے محاکمہ کرتے ہوئے تحریر کیا ہے ”حالانکہ مذکورہ دونوں دو باتیں ہیں، ان کا یکجا ذکر مناسب نہیں تھا، سرسید اور شبلی کے باہمی اختلافات اور ہیں، اور کلامی مباحث میں فرق واختلاف دوسری نوعیت رکھتا ہے“۔ ص ۸۰۔ آخر میں الیاس صاحب لکھتے ہیں ”عالم خوندمیری کے بعض خیالات سے اختلاف کی گنجائش ہے، مگر فکر اسلامی کی تشکیل جدید میں انہوں نے شبلی کے جس حصے کی اپنے خاص انداز میں توضیح کی ہے وہ قابل تحسین ہے“۔ ص ۸۰۔

اس خاص نمبر میں ایک مقالہ پروفیسر ابوظفر عبد الواحد کا ”مقالات شبلی“ کے عنوان سے ہے۔ اس عنوان کے تحت انہوں نے شبلی فارسی شاعری کا بھی جائزہ لیا ہے، اس کے متعلق ڈاکٹر الیاس نے لکھا ہے کہ ”بات شبلی کی فارسی شاعری کی ہو اور ان کے ان خطوط کا ذکر نہ آئے، جو انہوں نے عطیہ فیضی اور زہرا بیگم کو لکھے تھے، ممکن ہی نہیں۔ اور ان کے خطوط کا ذکر ہو تو شبلی کے عطیہ سے تعلقات زیر بحث نہ آئیں یہ بھی ناممکنات میں سے ہو گیا ہے۔ پروفیسر ابوظفر عبدالواحد صاحب بھی اس حصار میں گھرے، مگر انہوں نے آخر میں جو ”پوسٹ مارٹم“ کیا ہے وہ اس سلسلے میں بڑی اہمیت رکھتا ہے“۔ ص ۸۱۔ اسی نمبر میں آخری دو مضامین رضیہ بیگم اور محی الدین احمد کے قلم سے ہیں جس میں علامہ شبلی کی شعر فہمی اور شعر گوئی کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے۔ اور آخر میں مدیر صبا نے شبلی کے اردو اور فارسی کلام کا عمدہ انتخاب شامل کیا ہے۔ ص ۸۳۔ .... (باقی آئندہ ماہ)

ڈاکٹر رحیم رامش۔ حیدرآباد

عبدالرحمٰن جامی

(میرے استادِ محترم)

تھے حق کے پرستار رحمٰن جامی
وہ شاعر وہ فنکار رحمٰن جامی
یہ کہتا ہے سنسار رحمٰن جامی
کہ تھے نیک اطوار رحمٰن جامی
سبھی کو ہے اقرار رحمٰن جامی
تھے ہمدرد و غمخوار رحمٰن جامی
ہمیشہ غریبوں کی آفت زدوں کی
مدد کو تھے تیار رحمٰن جامی
اگر دوست احباب بے وقت آئیں
نہ ہوتے تھے بیزار رحمٰن جامی
نہ بھولے گی اردو زباں بھی کسی دم
یہ خدمت یہ ایثار رحمٰن جامی
رہیں گے دلوں میں سدا نقش بن کر
تمھارے یہ افکار رحمٰن جامی
مصیبت میں زحمت نہ دیتے کسی کو
بڑے ہی تھے خوددار رحمٰن جامی
تمھارے ہی دم سے تھا اردو ادب کا
یہ گلشن یہ گلزار رحمٰن جامی
سدا روح پھونکیں گے مُردہ دلوں میں
تمھارے یہ اشعار رحمٰن جامی
کبھی مرتے دم تک نہ بھولے گا رامش
تمھارا یہ کردار رحمٰن جامی

(قسط:۱) **ڈاکٹر محمد انور الدین**۔اسسٹنٹ پروفیسر وصدر شعبۂ اردو گورنمنٹ ڈگری کالج، فلک نما، حیدرآباد

شگوفہ کا باون سالہ سفر: بہ یک نظر

قبل اس کے کہ ماہ نامہ شگوفہ حیدرآباد کے باون برسوں کے شماروں سے متعلق گفتگو کی جائے، یہاں اس بات کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ ماہ نامہ شگوفہ ہند و پاک میں طنز و مزاح کے ایک نمائندہ جریدے کی حیثیت اختیار کر گیا ہے، جس کا سہرا اس کے ایڈیٹر و مالک ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال کے سر جاتا ہے ،زندہ دلان حیدرآباد کی تشکیل، اسے کارکرد بنانے میں ڈاکٹر مصطفیٰ کمال نے بہ حیثیت بانی رکن اور رکن مجلس عاملہ جو خدمات انجام دی ہیں وہ تاریخ کا حصہ ہے۔ موصوف نے زندہ دلان حیدرآباد کے ترجمان کے طور پر ۱۹۶۸ء میں ڈیڑھ ماہی رسالہ شگوفہ حیدرآباد شائع کیا تو شاید انھیں بھی اس بات کا اندازہ نہ رہا ہوگا کہ یہ رسالہ اتنا مقبول خاص و عام ہوگا۔

طنز و مزاح کو دوسرے درجے کا ادب کہا جاتا ہے، میں اس بحث میں پڑے بغیر اپنے مطالعے کی بنا پر صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ ۱۹۶۰ء کے بعد اردو ادب کی تاریخ اور روایت میں تحریکوں اور رجحانات کے فروغ کی وجہ سے سماج کے ترجمان کے سلسلے میں جہاں کہیں خلا نظر آتا ہے، اسے ہم شگوفہ کے گزشتہ باون سالہ پرچوں کے حوالے سے بہ آسانی پر کر سکتے ہیں۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ ماہ نامہ شگوفہ حیدرآباد بہ پابندی وقت مسلسل باون برسوں سے شائع ہو رہا ہے۔ اس ماہ نامے کا خصوصی وصف یہ رہا ہے کہ ہر سال کے اختتام پر یا کسی خاص موقعے پر شگوفہ کے خصوصی شمارے بھی شائع کیے جاتے ہیں، چناں چہ ماہ نامہ شگوفہ کے بے شمار خاص نمبر، اعزازی شمارے، سوونیر، بہ یاد اور گوشے شائع ہو کر منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئے ہیں جو کہ اپنی ادبی و صحافتی اہمیت کی بنا پر حوالے کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔

شگوفہ کے خصوصی شمارے:

ماہ نامہ شگوفہ ہر سال گیارہ عام شماروں اور سال کے آغاز پر ضخیم سال ناموں کے علاوہ خصوصی شمارے بھی شائع کرتا ہے۔ ان خصوصی شماروں کی تفصیلات کو اس مضمون میں ماہ و سال واری ترتیب کے لحاظ سے یکجا کیا گیا ہے۔

اعزازی شمارے:

شگوفہ نے شروع ہی سے مزاح نگاروں کی خدمات کا اعتراف کیا ہے، ساتھ ہی نئے لکھنے والوں کو موقع بھی فراہم کرتا ہے، ایسے ہی مزاح نگاروں کی ادبی خدمات کے اعتراف میں نیزان کی شخصیت اور فن کے جائزے کے علاوہ قومی و بین الاقوامی طنز و مزاح نگاروں کی تخلیقات کے انتخاب پر مبنی خصوصی شمارے بھی ماہ نامہ شگوفہ شائع کرتا ہے ۔یہ تفصیل بھی بتدریج دیکھی جا سکتی ہے۔

سوونیر:

زندہ دلان حیدرآباد کی تقریبات کے موقعے پر شگوفہ سوونیر شائع کرتا ہے جس میں سالانہ جلسوں کی روداد، رپورتاژ کے علاوہ ادبی اجلاس میں پیش کیے گئے انشائیے منتزاد مشاعرے میں پڑھے گئے کلام اور صدارتی

کلمات کو بھی شائع کرتا ہے۔اس شمارے کی خاص بات یہ رہتی ہے کہ سوونیر کے ابتدا میں زندہ دلانِ حیدرآباد اور اس کے ترجمان شگوفہ کے اراکین کی تصاویر شائع ہوتی ہیں۔

بہ یاد اور گوشے :

ماہ نامہ شگوفہ وقتاً فوقتاً بہ یاد شمارے اور گوشوں پر مشتمل شمارے بھی شائع کرتا ہے تا کہ خاص موقعوں پر مزاح نگاروں کی ہمت افزائی ہوسکے،ان کی تفصیلات بھی آگے آئیں گی۔

ذیل میں شگوفہ کی اشاعت اول سے لے کر فروری ۲۰۲۰ء تک کی ساری تفصیلات پیش کی جارہی ہیں تا کہ جہاں زندہ دلان حیدرآباد کے ترجمان ماہ نامہ شگوفہ حیدرآباد اور اس کے ایڈیٹر و مالک ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال کے لیے خراج تحسین ہے وہیں ریسرچ اسکالروں کے لیے مدد و معاون بھی ہے۔علاوہ ازیں قارئین کے لیے معلومات کا ذخیرہ بھی۔

۱۹۶۸ء:

❖ نومبر ر دسمبر میں تیسری کل ہند مزاحیہ کانفرنس کے بعد زندہ دلان حیدرآباد کے ترجمان کے طور پر دیڑھ ماہی شگوفہ جاری ہوا۔اس سے قبل مئی ۱۹۶۷ء میں دوسرے کل ہند مزاحیہ مشاعرے کے موقعے پر سوونیر شائع کیا گیا تھا،لیکن اس وقت تک شگوفہ کی اشاعت کا تصور بھی نہیں تھا۔

۱۹۶۹ء:

❖ دسمبر ۱۹۶۸ء تا جنوری ۱۹۶۹ء ڈیڑھ ماہی شگوفہ شائع کیا گیا جس میں سید مصطفیٰ کمال نے اس پہلے شمارے پر جلد (۱) شمارہ (۲) لکھا ہے،جس سے واضح ہوتا ہے کہ شمارہ (۱) وہ سوونیر ہے جو تیسری کل ہند مزاحیہ کانفرنس کے انعقاد کے بعد زندہ دلانِ حیدرآباد کے ترجمان کے طور پر جاری ہوا تھا۔

❖ فروری ر مارچ میں حیوان ظریف غالب نمبر

❖ مارچ راپریل ، مئی رجون، جون ر جولائی ، اگست رستمبر ، ستمبر ر اکتوبر اور نومبر ر دسمبر میں ڈیڑھ ماہی شمارے شائع ہوئے۔

۱۹۷۰ء:

❖ دسمبر ۱۹۶۹ء رجنوری ۱۹۷۰ء،فروری ر مارچ ، مارچ راپریل، مئی رجون اور جون رجولائی میں ڈیڑھ ماہی شمارے شائع ہوئے۔

❖ اگست رستمبر میں دیڑھ سالہ سالگرہ نمبر

❖ ستمبر ر اکتوبر اور نومبر ر دسمبر میں ڈیڑھ ماہی شمارے شائع ہوئے۔

❖ دسمبر ۱۹۷۰ء اور جنوری ۱۹۷۱ء میں سال نامہ

۱۹۷۱ء:

❖ جنوری اور فروری ۱۹۷۲ء میں سال نامہ

❖ مارچ راپریل، اپریل رمئی، مئی رجو ن، جولائی ر اگست ، اگست رستمبر، اکتوبر رنومبر اور نومبر ردسمبر میں ڈیڑھ ماہی شمارے شائع ہوئے۔

۱۹۷۲ء:

❖ جنوری۔فروری میں بھارت چند کھنہ نمبر

❖ فروری ر مارچ، اپریل رمئی اور مئی رجون میں ڈیڑھ ماہی شمارے شائع ہوئے۔

❖ جولائی راگست میں دیڑھ سالہ سالگرہ نمبر

❖ اگست رستمبر، ستمبر ر اکتوبر اور نومبر ر دسمبر میں ڈیڑھ ماہی شمارے شائع ہوئے۔

۱۹۷۳ء:

❖ دسمبر ۱۹۷۲ء اور جنوری ۱۹۷۳ء میں سال نامہ

❖ فروری ر مارچ، مارچ راپریل اور مئی رجون میں ڈیڑھ ماہی شمارے شائع ہوئے۔
❖ جون میں ڈیڑھ ماہی شگوفہ ماہ نامہ میں تبدیل کردیا گیا
❖ جولائی اور اگست میں ماہ نامے کی اشاعت عمل میں آئی۔
❖ ستمبر میں نریندر لوتھر نمبر
❖ اکتوبر تا دسمبر ماہ ناموں کی اشاعت عمل میں آئی۔

۱۹۷۴ء:

❖ جنوری میں سال نامہ
❖ فروری تا اگست ماہ ناموں کی اشاعت عمل میں آئی۔
❖ ستمبر میں کل ہند مزاحیہ مشاعرۂ بنگلور
❖ اکتوبر تا دسمبر ماہ ناموں کی اشاعت عمل میں آئی۔

۱۹۷۵ء:

❖ جنوری میں سال نامہ
❖ فروری تا نومبر ماہ ناموں کی اشاعت عمل میں آئی۔
❖ دسمبر میں سلیمان خطیب نمبر

۱۹۷۶ء:

❖ جنوری میں سال نامہ
❖ فروری تا مئی ماہ ناموں کی اشاعت عمل میں آئی۔
❖ جون کے شمارے میں زندہ دلان حیدرآباد کے نویں سالانہ اجتماع کی تفصیلات
❖ جولائی اور اگست میں ماہ ناموں کی اشاعت عمل میں آئی۔
❖ ستمبر میں پیروڈی نمبر
❖ اکتوبر تا دسمبر ماہ ناموں کی اشاعت عمل میں آئی۔

۱۹۷۷ء:

❖ جنوری میں سال نامہ
❖ فروری میں ماہ نامے کی اشاعت
❖ مارچ میں بیاد کرشن چندر
❖ اپریل تا اکتوبر ماہ ناموں کی اشاعت عمل میں آئی۔
❖ نومبر میں تخلص بھوپالی نمبر
❖ دسمبر میں ماہ نامے کی اشاعت

۱۹۷۸ء:

❖ جنوری میں سال نامہ
❖ فروری تا اپریل ماہ ناموں کی اشاعت عمل میں آئی۔
❖ مئی میں ابراہیم جلیس نمبر
❖ جون تا اکتوبر ماہ ناموں کی اشاعت عمل میں آئی۔
❖ نومبر میں بیاد سلیمان خطیب
❖ دسمبر میں ماہ نامے کی اشاعت

۱۹۷۹ء:

❖ جنوری میں سال نامہ
❖ فروری تا اکتوبر ماہ ناموں کی اشاعت عمل میں آئی۔
❖ نومبر کے شمارے میں زندہ دلان حیدرآباد کے بارھویں سالانہ تقاریب کے موقع پر سوونیر کی اجرائی
❖ دسمبر کے شمارے میں بارھویں کل ہند مزاحیہ مشاعرے کا منتخب کلام شامل ہے

۱۹۸۰ء:

❖ جنوری میں سال نامہ
❖ فروری اور مارچ میں ماہ ناموں کی اشاعت عمل میں آئی۔
❖ اپریل میں لکھنہ کارنر (جشن بھارت چند لکھنہ)
❖ مئی تا دسمبر ماہ ناموں کی اشاعت عمل میں آئی۔

۱۹۸۱ء:

❖ جنوری میں کنہیالال کپور نمبر
❖ فروری میں گوشۂ گرہ حیدرآبادی

❖ مارچ میں ماہ نامے کی اشاعت
❖ اپریل کے شمارے میں زندہ دلان حیدرآباد کے چودہ ویں
سالانہ تقاریب کے موقع پر سوونیر کی اجرائی
❖ مئی کے شمارے میں زندہ دلان حیدرآباد کے چودہ ویں
سالانہ اجتماع سے خطبہ صدارت اور رپورٹ شامل
❖ جون کے شمارے میں کل ہند مزاحیہ مشاعرہ سے کلام کی
اشاعت
❖ جولائی تا دسمبر ماہ ناموں کی اشاعت عمل میں آئی۔

۱۹۸۲ء:

❖ جنوری میں سال نامہ
❖ فروری تا دسمبر ماہ ناموں کی اشاعت عمل میں آئی۔

۱۹۸۳ء:

❖ جنوری میں سال نامہ
❖ فروری اور مارچ میں ماہ ناموں کی اشاعت عمل میں
آئی۔
❖ اپریل کے شمارے میں زندہ دلان حیدرآباد کے پندرہ
ویں
سالانہ تقاریب کے موقع پر سوونیر کی اجرائی
❖ مئی کے شمارے میں زندہ دلان حیدرآباد کے پندرہ ویں
سالانہ تقاریب سے خطبہ صدارت اور کل ہند مزاحیہ
مشاعرے سے انتخاب شامل ہے
❖ جون تا دسمبر ماہ ناموں کی اشاعت عمل میں آئی۔

۱۹۸۴ء:

❖ جنوری میں ماہ نامے کی اشاعت
❖ فروری تا مئی ماہ ناموں کی اشاعت عمل میں آئی۔
❖ جون میں خواجہ عبدالغفور نمبر
❖ جولائی تا دسمبر ماہ ناموں کی اشاعت عمل میں آئی۔

۱۹۸۵ء:

❖ جنوری میں گوشۂ راجندر سنگھ بیدی
❖ فروری میں سوونیر عالمی جشن مزاح
❖ مارچ تا جون ماہ ناموں کی اشاعت عمل میں آئی۔
❖ جون میں خصوصی شمارہ ہندوستانی مزاح نمبر (نثر)
❖ جولائی اور اگست میں ماہ ناموں کی اشاعت عمل میں
آئی۔
❖ ستمبر میں بہ یادشاذ و ناظم انصاری
❖ اکتوبر تا دسمبر ماہ ناموں کی اشاعت عمل میں آئی۔

۱۹۸۶ء:

❖ جنوری میں سال نامہ
❖ فروری اور مارچ میں ماہ ناموں کی اشاعت عمل میں آئی۔
❖ اپریل میں اکبری اقبال نمبر
❖ مئی تا اگست ماہ ناموں کی اشاعت عمل میں آئی۔
❖ ستمبر میں بہ یاد برق آشیانوی
❖ اکتوبر میں ماہ نامے کی اشاعت
❖ نومبر میں سوونیر کی اجرائی
❖ دسمبر میں ماہ نامے کی اشاعت

۱۹۸۷ء:

❖ جنوری میں سال نامہ
❖ فروری تا اکتوبر ماہ ناموں کی اشاعت عمل میں آئی۔
❖ نومبر میں سوونیر
❖ دسمبر کے شمارے میں سلور جوبلی کے موقعے پر منعقدہ
مقابلوں کی تفصیل اور انعام یافتہ تخلیقات کی اشاعت

............(باقی آئندہ ماہ)

احمد نور عینی۔استاذ المعہد العالی الاسلامی حیدر آباد

ذات پات کی لعنت، اصلاح کی کوششیں اور مستقبل کے خدشات

زائد از تین ہزار سال قبل ایک قوم یوریشیا سے آکر بھارت پر حملہ آور ہوئی، اس نے یہاں کی قوموں پر فتح پائی، فاتح کی حیثیت سے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی، یہاں کی قوموں کو اپنا محکوم بنا کر رکھنے اور ان کی بغاوت سے بچنے کے لیے پہلے سماج کو طبقات میں تقسیم کیا، پھر ذات پات کا نظام مستحکم کیا، یہاں کے سماج کو برہمن واد نے جاتی واد کی ایسی شراب پلائی کہ بھارتی سماج آج تک اس نشے سے افاقہ نہیں پاسکا،لطف تو یہ ہے کہ اسلام کے نام پر پڑوس میں ایک مملکت وجود میں آئی ذات وہاں بھی چلی گئی، کچھ عرصہ کے بعد مملکت کے دو ٹکڑے ہوئے؛ مگر ذات نہ ٹوٹ پائی، ماضی قدیم سے لے کر آج تک بھارت کی کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس پر زیادہ یا کم یہ نشہ نہ چڑھا ہو، جو تحریکیں اور جو مذاہب یہ نشہ اتارنے کے لیے برپا ہوئیں برہمن وادیوں نے کمال ہوشیاری اور عیاری سے ان کو بھی یہ نشہ چکھا دیا، سوائے اسلام کے کوئی ایسا مذہب نہیں جس کی صورت برہمن واد نے اپنے رنگ میں نہ رنگ دی ہو یا جس کے دامن پر ذات پات کا داغ نہ لگا دیا ہو، صرف اسلام ہی ہے جو آج بھی اپنی صاف شفاف تصویر اور اپنی واضح علیحدہ شناخت کے ساتھ موجود ہے، اسلام تو محفوظ رہا؛ مگر افسوس کہ مسلم سماج ذات پات کے اس نشہ سے محفوظ نہ رہ سکا، یہاں بھی اونچ نیچ کا تصور پیدا ہو گیا، کچھ ذاتیں کم تر اور کچھ ذاتیں برتر قرار پائیں، برتر ذاتوں کے نام کے لاحقے قابل فخر اور کم تر ذاتوں کے نام کے لاحقے قابل حقارت سمجھے گئے، ایک بڑی تعداد کے ذہن میں خاص ذات میں پیدا ہونا اور خاص پیشہ اپنانا فضیلت یا حقارت کا معیار بنا، زندگی کے بعض اہم مواقع پر مخصوص ذات کی بڑائی اور مخصوص ذات کی برائی کا تذکرہ کسی نہ کسی پہلو سے ہونے لگا، کم تر سمجھی جانے والی ذاتوں کی عزت نفس چوٹ کھانے لگی، کچھ لوگ احساس برتری اور کچھ لوگ احساس کمتری کی دنیا میں آباد ہو گئے، بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ قابلیت و کردار کے بجائے ذات وجہ ترجیح بنی، یہ سب کچھ اسلامی تعلیمات، اسلامی روح، اسلامی مزاج اور اسلامی اصول حیات و آداب زندگی و نظام معاشرت کے برخلاف ہوا اور ہو رہا ہے، یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ذات کا شعور تمام علاقوں میں یکساں نہیں ہے، کہیں یہ شعور تباہ کن حد تک بڑھا ہوا ہے، کہیں اس سے کچھ کم ہے، کہیں بہت حد تک کم ہے، کہیں برائے نام ہے، اسی طرح بعض حلقوں میں یہ صرف تعارف کی حد تک ہے، مختصر یہ کہ مسلم سماج میں ذات پات کی شدت، لعنت اور ذلت غیر مسلم سماج کی طرح نہیں ہے؛ مگر بالکل نہیں ہے ایسا بھی نہیں ہے۔

ذات پات اور برہمن واد کے خلاف اگر ہم ملک گیر سطح پر فکر اسلامی سے ہم آہنگ سماجی تحریک چھیڑتے ہیں اور خاطر خواہ کامیابی حاصل کرتے ہیں تو پھر مستقبل ہمارے لیے سازگار ہوگا، ورنہ مستقبل میں اسلام کی اشاعت وحفاظت کی راہ میں خدا نخواستہ دو بڑے چیلنجس کا سامنا ہو سکتا ہے، ایک اندرونی دوسرا بیرونی؛ اندرونی چیلنج تو وہ ہے جو مسلمانوں میں ہی پنپ رہا ہے، مسلمانوں کی پسماندہ ذاتوں کا ایک طبقہ اسلام کو اپنی تحریک سے بے دخل کر کے بل کہ نعوذ باللہ اسلام اور اسلامی لٹریچر کو ہی مطعون کر کے جاتی واد کے خلاف سرگرم ہے، گو کہ مسلم سماج میں اس کا کوئی مضبوط وجود نہیں ہے، اسی لیے غالباً ہم اس کی طرف توجہ نہیں دیتے ہیں؛ مگر غیر مسلم سماج میں اس کی وجہ سے اسلام کی شبیہ خراب ہو رہی ہے اور بہوجن سماج کے جاتی ورودھی و برہمنیت مخالف طبقہ کے ذہن میں جاتی واد کو بڑھاوا دینے کے اعتبار سے

اسلامی لٹریچر کی تصویر بھی برہمن لٹریچر جیسی بن رہی ہے۔ اس لیے ذات پات اور برہمن واد کے مسئلہ پر علماء اور صحیح الفکر دانشوروں کا میدان میں آنا ضروری ہے؛ اگر ہم اس میدان میں نہیں آئیں گے تو آگے ایک بڑا چیلنج درپیش ہونے کا امکان ہے، ماضی میں غیر مسلموں کے جاتی واد کی وجہ سے اس ملک میں تیزی سے اسلام پھیلا؛ لیکن اگر ہم نے ملک کے موجودہ منظرنامے کے پیش نظر کوئی حکمت عملی نہیں بنائی تو مستقبل میں مسلمانوں کے اندر کا جاتی واد اشاعت اسلام کے لیے چیلنج بن کر سامنے آ سکتا ہے۔

مسلمانوں میں جاتی واد کے خلاف جو طبقہ پسماندہ تحریک کی شکل میں سرگرم ہے وہ اس مسئلہ کا حل اسلام کو نہیں مانتا، بل کہ اس کے نزدیک اسلام میں بھی یا کم از کم اسلامی لٹریچر میں بھی جاتی واد ہے اور اس کے خیال میں مسلمانوں کے جاتی واد کو اسلام سے ہی یا کم از کم اسلامی لٹریچر سے ہی تائید حاصل ہے، نعوذ باللہ، اپنی تحریک کو اسلام اور پیغمبر اسلام سے لاتعلق کرنے کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ اس کے بعض قائدین کبیر داس کو اپنا آئیڈیل مانتے ہیں، برہمن واد کے خلاف کبیر داس کی خدمات سے انکار نہیں؛ برہمنیت کی تاریخ کا تجزیہ کرتے ہوئے کبیر داس کا نام ایک باغی اور انقلابی کی حیثیت سے ضرور آنا چاہیے؛ مگر پیغمبر اسلام سے قطع نظر کرتے ہوئے کبیر داس کو اپنا آئیڈیل ماننے کا پروپیگنڈہ کرنا اسلام کی صحیح تصویر پر پردہ ڈال دیتا ہے، بہوجن سماج کے جو لوگ برہمن واد کے خلاف سرگرم ہیں وہ مسلمانوں کے اس طبقے کو اپنے سے قریب کر رہے ہیں، کیوں کہ میدان میں تحریک کی شکل میں یہ لوگ بہ آسانی انھیں دستیاب ہو جاتے ہیں، مگر یہاں یہ بھی واضح رہے کہ پسماندہ تحریک کار بہوجن سماج کی ملک گیر سطح کی نمایاں تحریکی تنظیموں پر ابھی اثر انداز نہیں ہوئے ہیں، اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ان تنظیموں سے صحیح الفکر دانشوران وعلماء کرام وابستہ ہیں، جنھوں نے وہاں پہنچ کر اسلام کی صحیح نمائندگی اور مساوات اسلامی کی درست ترجمانی کی، ضرورت ہے کہ اس میدان میں صحیح الفکر وبصیرت مند علماء کرام زیادہ سے زیادہ تعداد میں اپنی شرکت درج کرائیں، تاکہ ذات پات کے خلاف غیر اسلامی فکر کے ساتھ جو لوگ تحریک چلا رہے ہیں ان کی اثر سے برادران وطن بالعموم اور بہوجن سماج کے تحریک کاران بالخصوص محفوظ رہیں، ان کی طرف سے پھیلائی جانے والی غلط فہمیاں دور ہوں، اور خود مسلم سماج سے ذات پات کا خاتمہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ہو، ذات کا شعور کم ہو اور امت واحدہ کا شعور پیدا ہو۔

ذات پات کے خلاف سرگرم رہنے والے پسماندہ تحریک کے مسلمان باضابطہ مضامین لکھ رہے ہیں، بیانات کر رہے ہیں، کتابیں ترتیب دے رہے ہیں اور ہر طرح کی کوشش کر کے مسلمانوں کی پسماندہ ذاتوں کو مسلمانوں کی اونچی ذاتوں کے خلاف کھڑا کرنے کی جدوجہد کر رہے ہیں، اور مسلمانوں میں ان کو خاطر خواہ کامیابی ملے یا نہ ملے؛ پر، بہوجن سماج میں جا کر یہ لوگ اسلام کی شبیہ خراب کر رہے ہیں، اور بہوجن سماج والوں کو چوں کہ دھرم کے نام پر غلام بنایا گیا اس لیے انھیں دھرم سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، یہ لوگ تو ان مسلمانوں کو یہ سمجھ کر قریب کر رہے ہیں کہ مسلمانوں میں بھی جاتی واد کے خلاف کچھ لوگ سرگرمی کے ساتھ کام کر رہے ہیں، بہوجن تحریک کاروں اور پسماندہ تحریک کاروں میں قربتیں اس لیے بھی بڑھ رہی ہیں کہ اول الذکر کو ثانی الذکر میں اپنے سے کافی مشابہت نظر آتی ہے، پسماندہ تحریک کار ذات پات کے خلاف کچھ اس انداز سے بحث کرتے ہیں کہ بہوجن تحریک کاروں کو لگتا ہے کہ جس طرح ہمارے سماج میں دو بیچہ (برہمن، چھتری، ویش)، شودر (بی سی) اور اتی شودر (ایس سی، ایس ٹی) کی تقسیم ہے، اسی طرح مسلم سماج میں اشراف، اجلاف اور ارذال کی تقسیم ہے، جس طرح ہمارے سماج میں سورنوں کا ورچسو (بالادستی) ہے اسی طرح مسلم سماج میں اشراف کا ورچسو ہے، جس طرح ہمارے سماج میں ودیشی برہمن، چھتری، ویش اپنے کو برتر اور مولنواسی شودر واتی شودر کو کم تر سمجھتے ہیں، اسی طرح مسلم سماج میں ودیشی سید، شیخ، پٹھان وغیرہ اپنے کو برتر اور مولنواسی اجلاف وارذال کو کم تر سمجھتے ہیں، جس طرح ہمارے سماج میں شودر واتی شودر کی ذاتوں کے ناموں کو حقارت کے

ساتھ ذکر کیا جاتا ہے اسی طرح مسلم سماج میں اجلاف وارذال کی ذاتوں کے نام کو حقارت کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے، جس طرح ہمارے سماج میں برہمن پنڈت یہ کہہ کر کہ ہم سب ایک ہیں، ہم سب ہندو ہیں ایس سی، ایس ٹی، بی سی کو دو یجہ کے خلاف الگ محاذ بنانیاور اپنے حقوق کے لیے کھڑا ہونے نہیں دیتے ہیں اسی طرح مسلم سماج میں اشراف علما یہ کہہ کر کہ ہم سب ایک ہیں، ہم سب مسلمان ہیں پسماندہ ذاتوں کو اشراف کے خلاف الگ محاذ بنانے اور اپنے حقوق کے لیے کھڑا ہونے نہیں دیتے ہیں، جس طرح ہمارے سماج میں مذہبی لٹریچر سے جاتی واد کو بڑھاوا ملتا ہے، اسی طرح مسلم سماج میں مذہبی لٹریچر سے جاتی واد کو بڑھاوا ملتا ہے۔ یہ وہ مشابہتیں ہیں جو بہوجن تحریک کاروں کو پسماندہ تحریک کاروں کی باتوں سے اور ان کے بیانیہ سے سمجھ میں آتی ہیں، ان مشابہتوں میں کتنی سچائی ہے اور کتنی غلط فہمیاں ہیں اس پر غور کرنا ضروری ہے، جو حقیقت ہو اسے ماننے، جو غلطی ہو اس کی اسلامی بنیادوں پر اصلاح کرنے، جو غلط فہمی ہو اسے دور کرنیکی ضرورت ہے، اسلام اور مسلم سماج کے بیچ میں ذات پات کے ناسور کی کیا حیثیت ہے اسے اسلامی مزاج اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں سمجھنے اور سمجھانے کی ضرورت ہے، مسلمانوں کو بھی سمجھانا ہے اور غیر مسلم برادران وطن کو بھی۔

پسماندہ کے نام سے برپا کی گئی یہ تحریک مسلمانوں میں ذات پات کی لعنت کو جڑ سے ختم نہ کرنے اور مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے کی ذاتوں کو ایسے الفاظ سے ذکر کرنے کا ردعمل ہے، جس سے عزت نفس کو ٹھیس پہنچتی ہے، ردعمل میں پیدا ہونے والے اس چیلنج سے نمٹنا ضروری ہے، مگر اپنے گریباں میں جھانکنا بھی ضروری ہے، صرف پاکی داماں کی حکایت سے مسئلہ حل نہیں ہوگا؛ بل کہ دامن کو بھی دیکھنا ہوگا اور بند قبا بھی، اپنے سماج کا جائزہ لینا ہوگا، جو غلطیاں ہوئی ہیں اس کا اعتراف کرنا ہوگا، اور جو غلط فہمیاں ہوئی ہیں انھیں دور کرنا ہوگا، اشراف کے ذہنوں سے یہ نکالنا ہوگا کہ تم برتر ہو اور پسماندہ ذاتوں کیذہنوں سے یہ نکالنا ہوگا کہ تم کمتر ہو، مسلم سماج میں جو ذاتیں اپنے کو برتر سمجھتی ہیں انھیں بھی اور جو کم تر سمجھتی ہیں انھیں بھی یہ سمجھانا ہوگا کہ پیدائش اور پیشہ کی بنیاد پر نہ کوئی افضل ہوسکتا ہے نہ ارذل، فضیلت کا معیار تقوی ہے، مسلم سماج کی ساری ذاتوں کو ایک جیسا عزت واحترام کا حقیقی مقام دینا ہوگا، دلوں کو ذات پات کی گندگی سے صاف کر کیان میں مساوات انسانی اور اخوت ایمانی کی پاکیزہ شراب انڈیلنی ہوگی، اسلام کی تعلیم مساوات کا سبق یاد دلانا ہوگا، ذات کے نام پر تسبیح کے بکھرے دانوں کو رشتہ ؟ الفت میں پرونا ہوگا؛ تا کہ مسلم سماج ذات سے اوپر اٹھ کر اسلام کا پیرو بنے؛ ورنہ:

یوں تو سید بھی ہو، مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو، بتاؤ تو مسلمان بھی ہو؟

اس چیلنج سے نمٹنے کے لیے مسلمانوں کے اندر سماجی سطح پر جاتی واد کے خلاف تحریک چھیڑنے، اسلامی مساوات کو سمجھانے، اسلامی مساوات پر وارد ہونے والے اعتراضات کا سنجیدگی سے جواب دینے اور ذات پات سے اوپر اٹھ کر امت واحدہ کا شعور بیدار کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ اس کام کو تحریکی شکل میں انجام دینا ہوگا، نیز ذات پات کے خلاف یہ تحریک اس انداز سے چلانی ہوگی کہ ذات کا شعور دبے اور ایک امت ہونے کا تصور ابھرے، اور حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ پسماندہ تحریک کے لوگوں سے جارحانہ مقابلے کی صف بندی نہ کی جائے، اس سے مسلمانوں کے اندر دو صف بندی ہوجائے گی اور دونوں کے درمیان کی خلیج کچھ اوروں کی عیاری اور کچھ اپنوں کی سادگی سے بڑھتی ہی جائے گی، اس لیے اس کے بجائے مسلمانوں میں مثبت انداز میں شعور بیداری کا کام کیا جائے، ذات پات کے خاتمے کے لیے ذہن سازی کی جائے، اور ذات پات کی شناعت اور انسانی مساوات کی اہمیت کو اسلامی نقطہ ؟ نظر سے اس طرح سمجھایا جائے کہ مسلم اور غیر مسلم سب کے سامنے اسلام کی صحیح تصویر آئے، بہوجن سماج کے برہمنیت مخالف مفکرین وتحریک کاران کی غلط فہمیاں دور ہوں اور عوام اسلام سے بدظن ہونے کے بجائے اس سے مانوس ہوں، پسماندہ تحریک کاروں نے ذات پات سے نمٹنے کے لیے جو

آئیڈیالوجی بنائی ہے وہ اسلام کی بنیاد پر استوار نہیں ہے، ان کی آئیڈیالوجی سے مسلم قوم کی وحدت دونیم ہوتی ہے، نیز اس سے یہ تو ہوسکتا ہے کہ پسماندہ ذاتوں کے مفادات کا تحفظ ہوجائے؛ لیکن اس سے ذات پات کا خاتمہ نہیں ہوسکتا، کیوں کہ اس سے ذات کا شعور ختم ہونے کے بجائے اور مضبوط ہوتا ہے، ذات پات سے نمٹنے کے لیے ایسی آئیڈیالوجی اپنائی جائے جو فکر اسلامی سے ہم آہنگ بھی ہو اور جاتی واد و برہمن واد کی بخیہ بھی ادھیڑتی ہو۔

بیرونی چیلنج یہ ہے کہ ایس سی، ایس ٹی، بی سی کے لوگ جوں جوں باشعور ہورہے ہیں خدا سے اور خدا کی طرف منسوب کتابوں سے حد درجہ متنفر ہورہے ہیں، کیوں کہ برہمنوں نے خدا اور اس کی طرف منسوب کتابوں کے نام پر یہاں کے طبقات کو اپنا غلام بنایا، اس لیے یہ لوگ نہ صرف برہمن سے متنفر ہورہے ہیں؛ بل کہ برہمن نے جس خدا کے نام پر اور خدا کی طرف مسنوب جن کتابوں کے سہارے انھیں غلام بنایا ان سب سے یہ لوگ بیزاری کا اظہار کر رہے ہیں، ان کی پوری تحریک کا محور ومقصد توحید انسانیت اور اکرام انسانیت ہے، توحید الہ اور اقرار الہ سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں ہے، ابھی جب تک کہ برہمن واد اور سنگھ واد کے خلاف ان کی جدوجہد جاری ہے اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ انھیں خدا سے اور اس کی کتاب سے مانوس کیا جائے، مانوس کرنے کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ انھیں ویدوں کے ذریعہ خدا کو سمجھایا جائے، یہ طریقہ کم از کم بہوجن سماج کے باشعور طبقے کو سمجھانے کے لیے انتہائی غلط ہے، اس سے بجائے فائدہ کے سخت نقصان ہوگا، ہمیں یہ طریقہ اپنانا ہوگا کہ ہم یہ بتائیں کہ برہمنوں نے تمھیں خدا کے نام پر غلام بنایا؛ مگر اسلام نے خدا کی تعلیمات کے ذریعہ مساوات قائم کی، غلام کو امام بنایا، ایک ہی صف میں محمود وایاز کو لا کھڑا کیا، گو کہ اس کائنات کا خدا ایک ہی ہے؛ مگر برہمنوں کا تصورِ خدا اور اسلام کا تصورِ خدا الگ ہے۔ برہمنوں کے تصورِ خدا کی وجہ سے آپ کو خدا سے جو نفرت ہوئی وہ ساری نفرت اسلام کے تصورِ خدا کو سمجھنے کے بعد دور ہوجائے گی۔ انھیں یہ بھی سمجھایا جائے کہ مسلمانوں کے اندر جو ذات پات ہے وہ ان کا دِین نہیں برہمن واد کی دَین ہے، اللہ تعالے نے قرآن کریم میں تمام انسانوں کو یکساں درجہ کا احترام دیا ہے، سب کو ایک باپ کی اولاد بنایا ہے، معیار فضیلت ذات، رنگ اور نسل کے بجائے تقوی کو قرار دیا ہے، مگر مسلمان برہمن واد کا شکار ہوگئے اور وہ اپنا سماج خدا کی دی ہوئی تعلیم کے مطابق تشکیل دینے میں ذات پات کے مسئلہ میں کہیں نہ کہیں ٹھوکر کھا گئے، ہم انھیں بھی سمجھا رہے ہیں، اور انھیں بھی خدا کے نام پر خدا کی کتاب قرآن کی تعلیم کے ذریعہ سماجی انصاف اور انسانی مساوات قائم کرنے کی تلقین کر رہے ہیں۔

ابھی وقت ہے کہ ہم بہوجن سماج کو خدا اور اس کی آخری کتاب سے مانوس کرسکیں، نیز انھیں یہ بتاسکیں کہ مسلم سماج کا بگاڑ خدا اور اس کی آخری کتاب سے دور ہونے کا نتیجہ ہے۔ ابھی ذہن سازی کے لیے ہمارے پاس موقع ہے؛ کیوں کہ ابھی بہوجن سماج کا فکری وتحریکی ارتکاز برہمن واد کے خلاف ہے، کل جب برہمن واد کے خلاف بہوجن سماج کا یہ طبقہ وسیع اور مضبوط ہوچکا ہوگا اور ہم نے برہمن واد کی تحریک کا حصہ بن کر اس طبقہ کو اسلام سے، خدا اور اس کی کتاب سے مانوس نہ کیا ہوگا تو خدا نخواستہ سخت چیلنج درپیش ہوگا، اسلام، خدا اور کتابِ خدا سے مانوس کرنے کے لیے سب سے پہلے آپس کی دوریاں ختم کرنی ہوں گی، خلیجیں پاٹنی ہوں گی، دوریاں ختم ہوں گی تو غلط فہمیاں بھی دور ہوں گی، نیز مسلم سماج کی اصلاح کرنی ہوگی، ذات پات کو ختم کرنے کی پوری کوشش کرنی ہوگی، ذات پات سے جکڑے علاقوں میں منعقد ہونے والے اصلاح معاشرہ کے جلسوں میں ذات پات کی لعنت کو ختم کرنے کی طرف خصوصی توجہ دینی ہوگی۔ یہ کام کرنا اور اسے اپنی ترجیحات میں شامل کرنا سخت ضروری ہے، دیر ضرور ہوئی ہے؛ مگر ابھی بھی موقع ہاتھ سے نہیں گیا ہے، آر ایس ایس کا دور اگر دھرم اور ہندوتو کے نام پر اندھی عقیدت میں مبتلا کرنے کا ہے تو کل جب یہ دور لد جائے گا اور برہمن واد کی ہندوتو وادی آئیڈیالوجی فکری سطح پر کمزور ہوگی (اور یقیناً ہوگی ان شاء اللہ) اور ہم نے ذات پات اور برہمن واد کے خلاف اپنے حصے کا کام نہیں کیا ہوگا...... (بقیہ ص: ۴۱/ پر)

مصطفی علی۔ ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی-110025

سوشل میڈیا اور اس کے مثبت و منفی اثرات

میڈیا کے لغوی معنی ہے ذریعہ۔ اس کے مختلف اقسام ہیں: پرنٹ میڈیا، الیکٹرانک میڈیا، سائبر میڈیا اور سوشل میڈیا۔ جب تحریر کے ذریعے ترسیل کا عمل ہوگا تو وہ پرنٹ میڈیا کے زمرے میں آئے گا جیسے اخبارات، رسائل، کتب اور پمفلٹ وغیرہ اور جب ترسیل کے عمل میں برقیات کا سہارا لیا جائے گا تو وہ الیکٹرانک میڈیا کہلائے گا، اس کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

ا۔ سمعی اس زمرے میں ریڈیو، ٹیلیفون اور وائرلیس وغیرہ آتے ہیں

۲۔ سمعی بصری اس حصے میں ٹیلی ویژن، سی ڈی، وی سی آر، سنیما وغیرہ آتے ہیں۔

اسی طرح جب ابلاغی (نہ کہ ترسیلی) عمل میں انٹرنیٹ ذریعہ بنے گا تو وہ سائبر یا سوشل میڈیا کے ضمن میں آئے گا جیسے بلاگ، فورم، مائکروبلاگنگ، پوڈ کاسٹ، نیٹ بینکنگ، آن لائن شاپنگ، گیمنگ سائٹس، سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس اور سماجی رابطوں کے بے شمار ویب سائٹس؛ مثلاً فیس بک، انسٹاگرام، ٹیلی گرام، ٹویٹر، گوگل پلس، ٹمبلر، مائی اسپیس، پنٹریسٹ، وائبر، وی چیٹ، ویبو، ویکیا، وی کے، لوکو، ہائک اسٹار، یوٹیوب، واٹس اپ، ای میل، آرکٹ، فلکیر، لنکڈ ان، ایس ایم ایس، اسنیپ چیٹ، ایمو، اسکائپ، ڈیو اور میسنجر وغیرہ، جن میں سے ہر ایک کے کام کا نہج ایک جیسا نہیں ہے مگر اس بحث کو اٹھانے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ترسیل اور ابلاغ کے فرق کو واضح کر دیا جائے۔

ڈاکٹر اشفاق محمد خان اپنی کتاب عوامی ذرائع ترسیل کے صفحہ نمبر ۹ پر ان دونوں کے مابین امتیاز کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

”ترسیل کسی بات کو پہنچانے کا عمل ہے؛ ابلاغ کا عمل اس کا نتیجہ ہوتا ہے اور اس میں سامعین، ناظرین اور قارئین کا ردعمل بھی شامل ہے جو اپنی جگہ ایک پہلو ہے اور جس کے اپنے الگ مسائل ہیں۔ ترسیل اور ابلاغ کے گہرے تعلق کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، مگر اس فرق کو مدنظر رکھنا بھی بہت اہم ہے۔“

سائبر میڈیا اور سوشل میڈیا میں ترسیل کی بجائے ابلاغ کی کارفرمائی ہوتی ہے، کیونکہ ان کے ردعمل میں کوئی رکاوٹ (Barrier) نہیں آتی۔ ان دونوں کے ذرائع تو مماثل ہیں یعنی دونوں کا کام انٹرنیٹ کے ذریعے ہی ہوتا ہے لیکن دونوں کے ابلاغ کا طریقۂ کار ذرا مختلف ہے۔ سائبر میڈیا کا زیادہ تر کام بین شخصی اور طبقاتی ابلاغ کے نہج پر ہوتا ہے جیسے نیٹ بینکنگ اور آن لائن شاپنگ۔ یہاں یہ سمجھ لینا نہایت ضروری ہے کہ سائبر میڈیا کا دائرہ بہت وسیع ہے یعنی آن لائن کیا جانے والا ہر کام سائبر میڈیا کے احاطے میں آتا ہے اور سوشل میڈیا بھی سائبر میڈیا کا ہی ایک حصہ ہے۔ ان دونوں کے مابین فصاحت اور بلاغت والا معاملہ ہے۔ جس طرح سے فصاحت، بلاغت میں شامل ہے یعنی جو چیز بلیغ ہوگی وہ لازماً فصیح بھی ہوگی لیکن جو چیز فصیح ہوگی ضروری نہیں کہ وہ بلیغ بھی ہو۔ ٹھیک اسی طرح سوشل میڈیا پر ہونے والا کام سائبر میڈیا کے زمرے میں تو آئے گا مگر سائبر میڈیا پر ہونے والا کام ضروری نہیں کہ سوشل میڈیا کے زمرے میں شامل ہو۔ ان دونوں کے ذرائع کی مماثلت اور سوشل میڈیا کے سائبر میڈیا کا

حصہ ہونے کی وجہ سے ہی سوشل میڈیا کرائم کو بھی سائبر کرائم کہا جاتا ہے۔ سائبر نیٹ ورکنگ سائٹس اور سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس میں سے کسی کے ابلاغ کا طریقہ عوامی ہے، کسی کا طبقاتی، کسی کا جماعتی اور کسی کا بین شخصی۔ جس کے توسط سے جانے والا پیغام سورس اور ریسیور تک محدود ہو وہ بین شخصی ابلاغ کے زمرے میں آئے گا جیسے واٹس اپ، میسنجر، اسکائپ، ڈیو، ایمو، ایس ایم ایس، ای میل، جی میل، ریڈف میل، یاہو میل، نیٹ بینکنگ، آن لائن شاپنگ وغیرہ ۔جس کے ذریعے بھیجا جانے والا پیغام سورس اور ریسیور سے آگے بڑھ کر کچھ اور (شمار شدہ) لوگوں کے درمیان پہنچے وہ جماعتی ابلاغ کے زمرے میں آئے گا جیسے گوگل پلس، کسی بھی سائٹس (میسنجر، واٹس اپ اور فیس بک وغیرہ) کا کلوز ڈ گروپ وغیرہ۔ جس کے سبب پیغام بے شمار لوگوں تک پہنچ رہا ہو مگر اس پیغام پر ریسیور کو اظہار رائے کا موقع نہ فراہم ہو تو وہ طبقاتی ابلاغ کے ضمن میں آئے گا جیسے بلاگ ،فورم، لوکو، آن لائن گیم وغیرہ۔ جس سائٹس سے پیغام کو وسیع تر دائرے میں لامحدود لوگوں کے بیچ رسائی حاصل ہو اور جہاں ہر عوام و خواص کے پاس اس پیغام پر لائک، کمنٹ یعنی اظہار رائے کا موقع فراہم ہو اور پیغام بھیجنے کی سہولت ہر کس و ناکس کے پاس یکساں ہو تو وہ عوامی ابلاغ میں شمار کیا جائے گا جیسے فیس بک، ٹویٹر، انسٹا گرام، یو ٹیوب، ہائک اسٹار، اسنیپ چیٹ، ٹیلی گرام وغیرہ۔

پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا کو ٹریڈیشنل (روایتی) میڈیا یا مین اسٹریم میڈیا بھی کہتے ہیں اور سائبر میڈیا وسوشل میڈیا کو نیو (نئی) میڈیا یا نان ٹریڈیشنل میڈیا بھی کہتے ہیں۔ نیو میڈیا عصر حاضر کی پیداوار ہے مگر ترقی کے معاملے میں اس نے ٹریڈیشنل میڈیا کو مات دے دی ہے۔ سوشل میڈیا انٹرنیٹ کے ذریعے ہی پیغام رسانی کا کام کرتا ہے۔ انٹرنیٹ ۲۹؍ اکتوبر ۱۹۶۰ء کو یونیورسٹی کیلیفورنیا لاس انجلس (UCLA) سے براہ راست جاری ہوا۔ پہلا وسیع TCP/IP (نیٹ ورک) ۱؍جنوری ۱۹۸۳ء میں امریکی قومی ادارہ برائے سائنس (NSF) نے ایک یونیورسٹی نیٹ ورک کا بنیادی ڈھانچہ تشکیل دیا، جو بعد میں NSFNET بنا۔ یہ انٹر نیٹ کی نئی تاریخ پیدائش مانی جاتی ہے۔ اس کے بعد انٹرنیٹ کو کاروباری مقاصد کے لیے کھول دیا گیا۔ نیٹ ورک کو ۱۹۹۰ کی دہائی میں اس وقت عوامی شناخت ملی جب یورپی تنظیم برائے مرکزی تحقیق (CERN) نے HTTP اور پہلے صفحہ حبالہ کے منصوبوں کے ۲؍سال بعد اگست ۱۹۹۱ء میں ورلڈ وائڈ ویب WWW کو عوامی سطح پر مشہور کیا۔ اس کے ٹھیک چھ سال بعد ۱۹۹۷ء میں six degrees of separation theory سے معاشرتی ابلاغ (SOCIAL MEDIA) کا جنم ہوا۔ فیس بک جو کہ سوشل میڈیا کی سب سے مشہور اور بڑی سائٹ ہے وہ ۲۰۰۴ء میں وجود پذیر ہوئی۔

دنیا کل سات براعظم میں منقسم ہے اور ساتوں پر کل سات عرب انسانوں کی آبادی ہے۔ ان سات میں سے دو عرب لوگوں پر سوشل میڈیا آکٹوپس کی طرح مسلط ہو چکا ہے۔ جس طرح مسجد میں ہر چھوٹا، بڑا، امیر، غریب، گورا کالا بس نمازی کی حیثیت رکھتا ہے ٹھیک اسی طرح سوشل میڈیا کا ہر صارف فقط صارف کی حیثیت رکھتا ہے اور سب کو برابر کا موقع میسر ہوتا ہے، کسی کو کسی پر کوئی ترجیح حاصل نہیں، چاہے وہ خواندہ ہو یا ناخواندہ، مزدور ہو یا سرمایہ دار، بوڑھا ہو یا بچہ، ایکسپرٹ ہو یا اناڑی، عورت ہو یا مرد، نیک ہو یا بد۔

منفی اثرات:

جہاں پر کوئی شجر ممنوعہ نام کی چیز نہ ہو وہاں بنی آدم کے بدکردار بھلا کیوں نہ بھٹکے۔ اور جب ایسے لوگ سوشل میڈیا کے ذریعے بدی کا اشتہار کرتے ہیں، کسی برگزیدہ شخصیت کی کردار کشی کرتے ہیں، غلط خبریں پھیلاتے ہیں، فراڈ آئی ڈی بنا کر کسی کو ٹھگتے ہیں، تصویریں ایڈٹ کر کے بلیک میل کرتے ہیں، افواہوں کی تشہیر کرتے ہیں تو مہذب و شریف لوگ اس سے متنفر ہو جاتے ہیں ٹھیک اسی طرح جس طرح سے شراب خانہ اور طوائف خانہ کے نزدیکی دکانوں سے معاشرے کے

شائستہ لوگ پرہیز کرنے لگتے ہیں۔ وہ اس وجہ سے بھی سوشل میڈیا کو نقصان دہ تصور کرتے ہیں کہ اس کے ذریعے وقت کا زیاں ہوتا ہے، حقیقی رشتوں سے بے اعتنائی برتی جانے لگتی ہے اور آپس میں دوریاں بڑھنے لگتی ہیں، لوگ اخلاقی زوال کا شکار ہونے لگتے ہیں اور صحت پر بھی مضر اثرات پڑتے ہیں۔ ہاں میں بھی مانتا ہوں کہ سوشل میڈیا کا کچھ سائڈ افیکٹ ضرور ہے پر اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ہم دوا و ٹانک کا صحیح استعمال بھی چھوڑ دیں۔ چلیے اس کے کچھ منفی اثرات جو ماہرین نے بتائے ہیں پہلے ہم وہی آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں:

آکسفورڈ یونیورسٹی کی ماہرِ نفسیات ڈاکٹر سزین گرین فیلڈ کا کہنا ہے کہ:

''مستقبل میں آنے والی نوجوان نسل اس واٹس اپ، فیس بک اور انسٹا گرام کی اتنی عادی ہو جائے گی کہ حقیقی زندگی میں رسمیہ گفتگو سے وہ خوف کھانے لگے گی۔ یہ ایک فوبیا کا روپ لے لے گا اور دماغی مرض بن جائے گا۔''

جانس ٹاؤن جرنل کے ایک رپورٹ کے مطابق:

''چالیس فی صد نوجوان شراب، سگریٹ اور گانجے کے لیے اسی سوشل میڈیا سے متاثر ہوتے ہیں۔''

جرمن یونیورسٹی کے ایک سروے میں پایا گیا کہ سوشل میڈیا کے صارفین میں سے ہر تیسرا نوجوان اکیلا پن، مایوسی اور تناؤ محسوس کرتا ہے۔ کاربن سنڈروم جس میں چوبیس گھنٹے انگلیاں کانپتی ہیں اس کے پچپن فی صد مریض اسی کے استعمال کنندہ ہوتے ہیں۔ فارمل ڈسورڈر جس میں مبتلا شخص یہ سوچتا ہے کہ مجھے چھوڑ کر باقی سب خوش ہیں، اس کے نناوے فی صد مریض اسی کے خوگر ہیں۔ ہر سال دنیا میں ۴۵۰۰ر خود کشیاں اسی سوشل میڈیا کی وجہ سے ہوتی ہیں۔

کیلیفورنیا یونیورسٹی کے محقق اور ماہرِ نفسیات لیری روزن کی تحقیقات کے مطابق فیس بک اور دیگر سوشل ویب سائٹس کے زیادہ استعمال سے انسان میں خود پرستی، نفسیاتی مشکلات، سماج دشمن رویے اور پرتشدد جذبات میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ان کے استعمال کرنے والے بچے اور بڑے نفسیاتی بیماریوں کا شکار ہو رہے ہیں۔

یونیسیم ایس ایچ ایم نیو جنریشن رپورٹ ۲۰۱۶ر میں پتہ چلتا ہے کہ ۷ سے ۱۴ سال کے بچے جو سوشل میڈیا پر سرگرم ہیں ان میں ۵۴ فی صد بچے فیک اکاؤنٹ استعمال کرتے ہیں۔

سیدہ تحریم فاطمہ ''سوشل میڈیا کے سماجی اثرات: لمحۂ فکریہ'' کے حوالے سے لکھتی ہیں کہ:

''عصرِ رواں میں ہمارے پاس معلومات و پیغامات کا ایک ہجوم ہے جو سیلاب کی طرح امڈتا چلا آ رہا ہے۔ محض ایک کلک پر دنیا جہاں کی معلومات آپ کے سامنے بکھری پڑی ہوتی ہیں۔ ہم اس ہجوم میں اتنا الجھ گئے ہیں کہ ہمارے اخلاقی اقدار، ہماری علمیت اور تخلیقیت صفر ہوتی جا رہی ہے۔ ہماری نوجوان نسل سوشل نیٹ ورکنگ ویب سائٹس کی تخلیق کے مقاصد تو دور اپنے مقاصدِ زندگی بھی بھولتے جا رہے ہیں۔ اس سوشل نیٹ ورکنگ نے ہمیں فیملی سے ڈس کنکٹ کر دیا ہے۔ ایک گھر میں رہنے والے دوسرے کی خبر نہیں رکھ پاتے، لیکن سات سمندر پار بیٹھے دوستوں اور واقف کاروں کو How r u? اور Get well soon کے پیغامات بھیجتے ضرور نظر آتے ہیں۔ ایک اور غلط رجحان جو معاشرے میں نمو پا رہا ہے وہ پرائیویسی کا احساس ختم ہو جانا ہے۔''

اس کے علاوہ سائبر کرائم کے بڑھتے واقعات بھی سوشل میڈیا کے منفی اثرات کو تقویت پہنچاتے ہیں۔ نیشنل کرائم رکارڈ بیورو کے مطابق ۲۰۱۰ میں جہاں آئی ٹی ایکٹ کے تحت ۹۶۶ر معاملے درج ہوئے تھے، وہیں ۲۰۱۱ر میں ان کی تعداد ۸۵ر فی صد بڑھ کر ۱۷۸۱ر ہو گئے۔ اسی طرح سائبر کرائم کے ۴۲۲ر معاملے آئی پی سی کے تحت درج ہوئے ہیں۔ ایسے معاملوں میں بھی گذشتہ برس کے مقابلے ۱۸ر فی صد کا اضافہ ہوا۔

سوشل میڈیا کی وجہ سے کبھی روزگار چھن جاتی ہے جیسا کہ بیف پروسنے کی افواہ پر جئے پور کے ایک ہوٹل میں ۲۷؍دنوں تک تالا لٹکا رہا اور کبھی اس کے سبب دنگا بھڑک جاتا ہے جیسا کہ ستمبر ۲۰۱۳؍ میں مظفر نگر میں ایک آدمی کے گلا ریتنے کا ویڈیو وائرل ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے دنگے کی صورت اختیار کر گیا۔ کبھی اس کے ذریعے افواہیں پھیلا کر لوگوں میں ہیجان برپا کر دیا جاتا ہے جیسا کہ نوٹ بندی کے وقت ہوا، اس وقت لوگوں نے ۲۰۰۰ کے نوٹوں میں مائکرو چپ کے ساتھ جی پی ایس، وائی فائی اور ہڈین کیمرہ تک لگے ہونے کی جھوٹی خبر سوشل میڈیا کے ذریعے مشہور کر ڈالی۔

اسی طرح کئی مرتبہ سوشل میڈیا پر حکومت کی طرف سے روک لگا دیا جانا بھی اس کے منفی پہلو کو اجاگر کرتا ہے۔ دنگا بھڑکنے کے وقت جموکشمیر میں، کسان آندولن کے وقت مدھیہ پردیش میں اور آسام تشدد کے بعد وہاں پر بھی سوشل نیٹ ورکنگ سائٹیں بند ہوئی تھیں۔ آسام تشدد کے بعد سوشل نیٹ ورکنگ سائٹوں سمیت کل ۳۱۰؍ یو آر ایل یعنی یونی فارم ریسورس لوکیٹر کو ممنوعہ قرار دے دیا گیا۔ ان میں ۲۸؍ ٹیوٹر، ۱۰۲؍ فیس بک، ۸۵؍ یوٹیوب، ۱۱؍ بلاگر اور ۸؍ ورڈ پریس شامل ہیں۔ اس کے علاوہ بھی متعدد مرتبہ اس کی سروسز بند کی گئیں۔

مختصر یہ کہ بہت سے لوگ اسے دھیما زہر اور فساد کا بڑا ذریعہ گردانتے ہیں اور ماہرین بھی اس کے منفی اثرات کی طرف نشاندہی کرتے ہیں۔ آج بھی ٹریڈیشنل میڈیا ذمہ داری، جوابدہی اور اعتباریت رکھتا ہے جبکہ ان میں سے کوئی بھی شئے سوشل میڈیا کے پاس نام کو نہیں مگر ان سب کے باوجود اس کے مثبت اثرات سے کون شخص انکار کر سکتا ہے۔ اب ہم اس کے کچھ مثبت اثرات کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں۔

مثبت اثرات:

کیا ترسیل و ابلاغ کا اس سے تیز ذریعہ کوئی اور ہے؟ کیا کوئی اور میڈیا سماج کے ہر طبقے کو یکساں موقع فراہم کرتا ہے؟ کیا کسی اور میڈیا سے سماج کی اتنی بڑی تعداد منسلک نظر آتی ہے؟ کیا کسی اور میڈیا تک اتنی آسانی سے پہنچا جا سکتا ہے؟ کیا اس کے علاوہ کوئی ایسا میڈیا ہے جہاں پر لوگوں کو یہ احساس ہو کہ کوئی اسے سن رہا ہے، دیکھ رہا ہے یا پڑھ رہا ہے؟ کیا ملالہ کو نوبل امن انعام دلانے، اڈیسہ کی یتیم اور معمولی لڑکی ٹومپا کو بالی ووڈ میں متعارف کرانے، مصر، شام، لبنان اور ترک میں انقلاب برپا کرنے میں سوشل میڈیا نے اہم کردار ادا نہیں کیا؟ کیا نربھیا کو انصاف دلانے، آسارام، رام لال، بابا رام رحیم، تیز پال اور نارائن سائیں جیسے زانیوں کو جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے پہنچانے میں یہ مظلوموں کی آواز نہیں بنا؟ یہ الگ بات کہ ابھی تک بابری مسجد انہدام کے قصور واروں، سیریا اور فلسطین کے تباہ کاروں، معصوم بچی آصفہ کے ظالموں اور انہی جیسے اور بھی واقعات کے خطا کاروں کو کیفرِ کردار تک پہنچانا باقی رہ گیا ہے۔

اس کے ذریعے خود کو اپڈیٹ رکھا جا سکتا ہے۔ ہر نئی بات کی جانکاری برابر ملتی رہے گی۔ اس کے سبب نئے لوگوں سے جڑ پانا اور دور رہ رہے رشتہ داروں سے رابطہ کرنا بہت ہی آسان ہو جاتا ہے۔ پیسوں اور وقت کی بچت ہوتی ہے۔ کوئی بھی جانکاری منٹوں میں عوام تک پہنچایا جا سکتا ہے۔ اطلاعات، تفریح اور علم کا حصول سہولت سے دستیاب ہو جاتا ہے۔ ابھی فی الحال کورونا تالابندی (Lockdown) کے سبب جب راستے مسدود ہو گئے تو تمام کلاسیں، میٹنگیں اور پروگرامز وغیرہ گوگل میٹ، زوم، مائکروسافٹ یا پھر اسی طرح کے دوسرے ایپ کی مدد سے جاری و ساری رکھے گئے۔ ان آن لائن سوشل میڈیا ایپس نے یہ سہولت فراہم کر دی کہ کسی چھوٹے سے گاؤں میں رہنے والا کوئی طالب علم گھر بیٹھے سات سمندر پار کے کسی کالج یا یونیورسٹی سے کوئی کورس کر سکا، کسی میٹنگ یا پروگرام میں دور دراز رہنے والے کسی مشہور اور بڑے مصنف کو جوڑا جا سکا اور خاص بات یہ کہ طلبہ کی تعلیم کا سلسلہ چلتا رہا۔ ذرا

سوچیں کہ اگر سوشل میڈیا کی یہ سہولت ہمیں فراہم نہ ہوتی تو اس تالا بندی میں ہمارا کیا حشر ہوتا؟

دیگر ممالک سوشل میڈیا کو معاشرے میں شعور و بے داری پیدا کرنے کے لیے انقلابی اوزار کی صورت میں استعمال کرتے ہیں اور ہندوستانی معاشرے میں ہم لوگ تفریح و خودنمائی سے باہر ہی نہیں نکل سکتے تو اس کا مثبت استعمال اللہ جانے کیا سیکھیں گے۔ کسی محقق و ماہر نفسیات نے اسی کو مدنظر رکھتے ہوئے کہا تھا کہ ہندوستانی معاشرہ ابھی اس قابل نہیں ہوا تھا کہ وہاں پر سوشل میڈیا کی سہولت فراہم کی جاتی۔ خیران سب باتوں کو چھوڑیے اور مختصراً بس اتنا سمجھ لیجیے کہ اس کے مثبت اثرات کی بھی ایک لمبی فہرست ہے۔ جس کی وجہ سے اس کا استعمال بند کر دینا یا اس سے دوری اختیار کر لینا صریح حماقت ہوگی۔ یہ ایک میڈیم ہے، ذریعہ ہے اور جب تک ذریعے کا غلط استعمال نہ کیا جائے وہ بذات خود غلط نہیں ہوسکتا۔ سوشل میڈیا سماج کا حقیقی آئینہ ہے۔ اب جہاں کا سماج جیسا ہوگا سوشل میڈیا اس کو ویسا دکھائے گا۔ اور اگر سماج کو خود ہی بدلنے کی فکر نہ ہو تو سوشل میڈیا بھلا کیا کرے۔

آپ اس کے اوپر جتنا چاہے الزام دھر لیں مگر اس کے استعمال سے نہ کترائیں ورنہ نقصان آپ کا ہوگا۔ ہاں! اس کے استعمال میں کچھ احتیاط برتا جاسکتا ہے اور وہ احتیاط ہمیں خود ہی برتنا ہوگا کیوں کہ اس سلسلے میں حکومت آپ ہی پریشان نظر آتی ہے تو ہماری آپ کی حفاظت کیا کرے گی۔ وزیر اعظم دفتر اور سی بی آئی جیسے حساس اداروں کی اہم ویب سائٹوں پر سائبر حملے ہو چکے ہیں۔ صرف دولت مشترکہ کھیلوں کے دوران ہندوستانی ویب سائٹوں پر تقریباً ۸۰۰۰ر سائبر حملے ہوئے تھے۔ ان شر پسند عناصر سے بچنے کے لیے آئی ٹی ایکٹ ۲۰۰۸ء میں ہوئی ترمیم کے مطابق سیکشن 66(A) کے تحت جو قانون بنا ہے، اس میں یہ انتظام ہے کہ سوشل میڈیا کے تحت سماجی تانے بانے کو نقصان پہنچانے والوں اور افواہیں پھیلانے والوں کے خلاف کارروائی ہوسکتی ہے۔ جرم ثابت ہونے پر تین سال کی سزا بھی ہوسکتی ہے۔ مگر اس قانون میں لوچ بہت ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ سائبر کرائم کو ضمانتی جرائم کے زمرے میں رکھا گیا ہے اور دوسری بات یہ کہ زیادہ سے زیادہ تین سال کی سزا رکھی گئی ہے۔ اس کے علاوہ قابل اعتراض مواد اپلوڈ ہونے پر متعلقہ ویب سائٹ کو نوٹس دینے کے ۳۶ر گھنٹے کے اندر اسے ہٹانا ہوتا ہے۔ اتنی دیر تک قابل اعتراض مواد سائٹ پر رہے گا تو وہ اپنا کام کر ہی جائے گا۔ اس کے علاوہ قانون کو عملی جامہ پہنانے کے لیے پولس میں جو سائبر کرائم سیل بنا ہے وہ برائے نام ہے، ان میں سائبر ایکسپرٹ کی کمی ہے۔ سائبر کرائم کے نام پر انٹرنیٹ کے ذریعے صرف دھوکہ دہی اور عریانیت کو فروغ دینے والے معاملے درج ہوتے ہیں۔ کئی بار ایسی شکایتیں سامنے آئی ہیں کہ اشتعال پھیلانے، غلط معلومات دینے، لوگوں کے درمیان نفرت پیدا کرنے، افواہ پھیلانے اور کسی کی کردار کشی کرنے والے معاملے مندرج نہیں ہوئے۔ اسی لیے بذات خود محتاط رہنا از حد ضروری ہے۔ کچھ احتیاطی تدابیر آپ کی خدمت میں پیش کر کے میں اپنی بات ختم کرتا ہوں:

۱۔ ہمیشہ اپنی پوری جانکاری اپلوڈ نہ کریں، کیونکہ یہاں سے آپ کی جانکاری کو چوری کیا جا سکتا ہے۔ ابھی دو سال قبل مارک جوکر برگ کے اوپر اسی سبب مقدمہ ہوا ہے۔

۲۔ اپنے ذاتی تصاویر سوشل میڈیا پر اپلوڈ نہ کریں کیونکہ کوئی اس کا غلط استعمال کر سکتا ہے۔

۳۔ اکثر کم عمر بچے اپنی غلط جانکاری اپلوڈ کر کے ان سائٹس پر اکاؤنٹ بنا لیتے ہیں، اگر آپ کے گھر کے بچے بھی ایسا کر رہے ہوں تو انھیں ایسا کرنے سے منع کریں۔

۴۔ اگر صارف کو سوشل میڈیا پر بھٹکنے کی شکایت ہو تو اسے استعمال کا وقت متعین کر لینا چاہیے۔

۵۔ کسی بھی پیغام کو ارسال یا فارورڈ کرنے سے پہلے کراس چیک ضرور کر لیں۔

نواز احمد۔ ریسرچ اسکالر ای۔ ایف۔ ایل یونیورسٹی، حیدرآباد

بین القصرین (عربی ناول) تجزیاتی مطالعہ کے آئینے میں

یوں تو نجیب محفوظ کے معرکتہ الآراء قلم سے بہت سے لاجواب ناول زینت قرطاس بنے، لیکن ان میں (بین القصرین) اپنے پارٹ وکردار میں منفرد مقام رکھتا ہے، یہ محض ایک ناول نہیں کہ صاحب تحریر نے زبان کے چٹخارے لئے ہوں، فکروفن کے قلابے ملائے ہوں، بلکہ یہ اپنے اندر مصری تاریخ کا ایک جہاں سمائے ہے، طرز بودوباش سے سیاست کے اتار چڑھاؤ اور مدوزجر تک انقلاب کی کہانیوں کے مندرجات اس میں تحریر ہیں۔

یہ ناول شہر قاہرہ کی قومی وقدیم شاہراہ پر بسے ایک متوسط خاندان کی کہانی سے شروع ہوتا ہے جس میں ایک سربراہ خانہ ہے جس کا نام (سید احمد عبدالجود) ہے، جس کا مزاج انتہائی سخت، تلخ وترش ہے، اس کے ذوق وفکر کے خلاف کچھ کرنا اپنے آپ کو مصیبت میں ڈالنا ہے، سارا خاندان اسی کے رعب میں ہے، غرض در خانہ اسی کے حکم سے دروازے کھلتے اور زنجیریں کٹتی ہیں، اس خاندان میں اہلیہ امینہ بھی ہیں جو شادی کے بعد سے اب تک گھر کی دہلیز تک کو پار کرنے میں جواد صاحب کے حکم کی محتاج ہیں، جو قاہرہ شہر میں ہوتے ہوئے بھی قاہرہ سے بے خبر ہیں، جہاں کی گلیوں، چوراہوں سے اسے کوئی لینا دینا نہیں غضب یہ ہے کہ وہ اپنے ہی شوہر کی مارکیٹ سے واقف نہیں، وہ گھر سے دس منٹ کی دوری تک بھی اپنی مرضی سے نہیں جاسکتی، اس کی شادی کو بیس سال ہو چکے ہیں، لیکن گھر سے باہر جانے کی خواہش میں ہمیشہ اس کا خوفناک شوہر آڑے آتا، اس کی ساری تگ ودو گھر کے اندر ہے۔ اس خاندان میں ان دونوں کے تین بیٹے ہیں یاسین، فہمی اور کمال اور دو بیٹیاں ہیں جن کا نام خدیجہ وعائشہ ہے، ان کی شادی جواد صاحب کی پسند سے طے ہوئی ہیں، جواد صاحب متقی و پرہیزگار ہیں، نمازی ہیں خدا کے قہر وغضب سے ڈرتے ہیں باہر خوش اخلاق ہیں لیکن گھر پہ معتدل نہیں، بچوں سے پسند ناپسند پوچھتے ہیں قدیم رسوم ورواج اور روایات واخلاق پر مصر ہیں، بچے باپ سے سامنے ڈرتے ہیں پر پس پردہ عشق ومعاشقہ جاری ہے۔ یاسین جواد صاحب کی پہلی بیوی کی یادگار ہے، جیسے انہوں نے طلاق دے دی تھی، یاسین ہوس کی تکمیل کے سامان تلاشتا پھرتا ہے، عائشہ قریب البلوغ ہے، وہ بھی ایک آفیسر پر فدا ہے اور اس کے راستے دیکھتی ہے گھنٹوں دروازے کی اوٹ سے اس کے ایک جھلک پانے کی متمنی ہے، فہمی کمال کے ساتھ چھت پر سبق کا اعادہ کررہا ہے کہ کوئی حسینہ چھت پر نمودار ہوئی کہ اس سے آنکھیں چار کرنے لگا۔

ناول کے ابواب کے مابین جواد صاحب کی شخصیت دھیرے دھیرے نکھرتی جاتی ہے، سارے سیاق و سباق سے پتا چلتا ہے کہ اس سخت گیر اور قدیم روایات کے فرسودہ والد کی ساری توجہ فیملی کو اپنے ماتحت رکھنے میں ہے، وہ اسی کو اپنی عزت وشرافت اور اخلاقی کمال سمجھتا ہے، کہ بچے چوں چراں نہ کریں، سر نہ اٹھائیں، اس کے ہر فکر و

سوچ اور فہم کی تکمیل کے لیے دوڑتے پھریں، بیوی خدمت گزاری میں لگی رہے، اس کے لیے جواد صاحب گھر کے اندر کبھی ہسنتے نہیں، مزاح نہیں کرتے کہ بیوی بچے سر پر سوار نہ ہو جائیں، نجیب کی نظر میں جواد صاحب کی یہ کمزوری ہے، جو تربیت میں منافی ہے، سختی اور بے جا قدیم روایات پر اصرار سے وہ اپنی فطری وحقیقی شخصیت کو چھپا رہا ہے، جو کسی طور مناسب نہیں، فطرت کو دبانے سے فطرت نہیں دبتی، فطرت کو تربیت کے دائرے میں لانا ہوتا ہے، نجیب کہتا ہے کہ اگر جواد صاحب دباؤ کے بجائے ڈھیل دے کر تربیت کرتے مناسب ہوتا، پھر بچے یوں چھپ چھپ ہوس کی تکمیل کو نا دوڑتے، یاسین، فہمی، کمال و عائشہ یوں عشق و معاشقے لڑاتے نہ پھرتے۔

نجیب محفوظ کے اس ناول سے جہاں جواد صاحب کی سخت گیری کا پتہ چلتا ہے، وہیں سیاست اور سیاسی خبروں کے بھی وہ رسیا ہیں، سیاست میں بھی ان کا مزاج فرسودہ ہے، وہ ظلم وزیادتی اور حقوق غصبی کے لئے اپنے لوگوں کو ذمہ دار سمجھتا ہے، ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے، سیاست سے ٹکرانے کو حرام سمجھتا ہے، اور اسے وہ وطن پرستی اور وطن دوستی کے طور پر پیش کرتا ہے، اپنا یہ مزاج بھی وہ افراد خانہ پر مڑھنا چاہتا ہے، سیاست کے معاملے میں بھی افراد خانہ میں تضاد ہے، سربراہ خانہ کے نظریات جدا ہیں، جب کہ ایک بیٹا جس کا نام فہمی ہے اسکی سرگرمیاں جدا، یہ ناول خاندان کی اس سیاسی چپقلش کے ساتھ ساتھ سیاست کے ساتھ انکی گہرائی، رابطہ اور جوڑ کا بھی بتدریج تذکرہ کرتا ہے۔ فہمی کی سیاسی سرگرمیاں کیا اور کیسی تھیں؟ افراد خانہ کی اس سیاسی تضاد کا نتیجہ کیا کچھ برآمد ہوا، ان سب کی گرہ کشائی ہوتی ہے۔

فہمی کی سیاست میں انٹری پڑھائی کے دوران ہی ہو جاتی ہے، وہ طلباء کمیٹی کا رکن بنتا ہے، ۱۹۱۹ م کی بغاوت کے موقع پر اس کے کئی خفیہ تنظیموں سے رابطے اور رکنیت اس کے پاس ہوتی ہے، دراصل فہمی والد صاحب کے مقابلے مصری سرزمیں پر امن و نظام کے لیے اسلامی خلافت اور گورنر عباس کی واپسی پر یقین رکھتا ہے، اسے پورا یقین ہے کہ یہی وہ جماعت ہے جو مصری باشندوں کی غلامی کے طوق کی کرچیاں بکھیر سکتی ہے، اور مصر کو مکمل اور پائدار آزادی فراہم کر سکتی ہے، جب کے سخت گیر والد اس قدم کو بغاوت کہتا ہے یہ عمل اس کے نزدیک وطن پرستی کے مخالف ہے، وطن سے محبت کا تقاضا یہ ہے کہ چپ چاپ نظریں جھکائے بیٹھے رہو، چنانچہ باپ بیٹے کے جداگانہ سیاسی نظریات نے گھر کے اندر ہی معرکہ بپا کر دیا، والد کی رائے، سوچ وفکر کے خلاف ہونا چنانچہ نافرمانی تصور ہوتا تھا، اس لئے والد محترم فہمی کو اس کے نظریات کے تضاد کی وجہ سے نافرمان قرار دے رہے ہیں، وہ افراد خانہ کو الگ رجحانات ونظریات کے بھیانک انجام کا بتاتے ہوئے انہیں اندھی تقلید پر راغب کرتا ہے، فہمی جو اب سیاست میں تقریبا بالغ ہو چکا ہے، وہ والد کے شدید غصے کے باوجود اپنے نظریات پر قائم ہے، اور دلیلیں دیئے جا رہا ہے، اندرون خانہ یہ پہلا موقع ہے جب سربراہ خانہ مبہوت ہے، بے بس ہے، مجبور ہے، وہ اس خاندانی بغاوت کو کچلنے پر قادر نہیں، اور یہ پہلی مرتبہ ہے جب فہمی اس خاندانی اندھی تقلیدی خول کو توڑنے پر قادر ہوا، سوچ وفکر کے سانچوں کے بدلنے سے حالات، واقعات، اور سیاست کیسے بدلتی ہے، یہ آپ

اس ناول سے خصوصی طور پر اخذ کر سکتے ہیں کہ جو چیز جواد صاحب کے نزدیک بغاوت تھی ،وہی فہمی کے نزدیک انقلاب، جسے جواد صاحب وطن دشمنی گردانتے تھے فہمی اسی کو عین وطن پرستی اور محبت وطن کہتا تھا، انقلاب کی روداد کو بیان کرتے ہوے نجیب محفوظ تفصیل سے لکھتے ہیں کہ وہ مصر میں پھیلی انارکی ، بے ضابطگی و بے قاعدگی سے تنگ تھا ، باشندگان مصر پر انگریزی حکومت اس کی آنکھوں میں کھٹکتی تھی ، وہ آئے روز کے مظالم سے سخت غصے میں تھا ، وہ مصر کو آزاد کروانا چاہتا تھا ، اس نے مصر کو ایک نیا ملک سمجھا ، انقلاب نے اس کی روح و وجدان کو نئی سمت عطا کی ، انقلاب اس کا مقصد تھا ، وہ سعد زغلول پر قہر بن کر ٹوٹنا چاہتا تھا ، اور مصر کو ان کے ناپاک سایوں سے بچانے کی سعی کر رہا تھا ، چنانچہ دو مظاہرے ہوئے اور وہ ان کے شانہ بشانہ تھا ،اس کا ذہن مزید انقلاب کا متمنی رہا۔

فہمی کی سعید قسمت کے ایک تو وہ طالبعلم تھا ، دوسرے اس کا مرکز علم وہی مدرسہ تھا جس نے انقلاب کے شعلے کو بلندی فراہم کی وہ جماعت طلبہ کا ہیڈ تھا ، اور فرنٹ سے اس سارے انقلاب کو لیڈ کر رہا تھا ، اس کا جوش وجنون بڑھتا رہا اس نے قیادت کے جھنڈے کی حفاظت پر ساری توانائی صرف کی ، وہ صفوں سے بہت آگے نکل چکا تھا ، اس کی تڑپ ولگن اور جان ہتھیلی پر لئے پھرنے کی عادت بہت آگے لے جا چکی تھی ، یہی سب چل رہا تھا کہ یکا یک نیا موڑ آیا اور انقلابی جد و جہد کے ایک مظاہرے کی قیادت کا عمل اسے جام شہادت پلا گیا ، فہمی کی موت پر ناول اختتام کو پہنچتا ہے۔

نجیب محفوظ اپنے اس ناول میں ایک ایسے ناول نگار کے طور پر سامنے آتے ہیں جو واقعات کی پوری امانت کے ساتھ تصویر کشی کرتا ہے ، اور اپنے ناولز کے ہیرو سے ایسے زندہ شخصیتوں کو وجود دیتا ہے جو مکمل زندگی گزارتی ہیں۔ اور جو جذبات اور خواہشات سے بھر پور مکمل زندگی گزارتے ہیں۔ اور وہ ان چند ناول نگاروں میں سے ایک ہیں جو انسانیت کی ایسی زندگی کے بارے میں لکھتے ہیں جس میں کبھی کبھی غیر انسانی حالات بھی پیش آتے ہیں۔ اور جس معاشرے میں عورتوں کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی ، یا ایسے انسان کے طور پر ہوتی ہے جسکا اپنا کوئی ارادہ اور خواہش نہیں ہوتی ، گویا اسکی حیثیت صرف ایک ایسی جنسی کی ہوتی ہے جو اگر بیوی بن جائے تو ایک کارخانہ میں تبدیل ہو جاتی ہے ، جسکا کام صرف بچہ پیدا کرنا ہے ، گھر کی خدمت کرنا ، اور شوہر کی غلامی کرنا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ نجیب محفوظ مصر کے متوسط طبقہ کے کاتب ہیں ، پھر اس ناول میں انہوں نے بہت سارے طبقات میں سے متوسط طبقہ کی زندگی پر روشنی ڈالی ہے ، جس طبقہ نے مصری بغاوت میں حصہ لیا ہے۔ ، چنانچہ نجیب نے تاجر احمد عبدالجواد اور انکے پڑھے لکھے بیٹے فہمی کو اپنی ناول کے ہیرو کے طور پر پیش کیا ہے ، کیونکہ اس زمانے میں طلبہ ہی انقلاب کے علمبردار ہوا کرتے تھے اور جلا بخشنے کا کام کرتے تھے ، ان میں سے اکثریت ایسے طبقہ سے تعلق رکھتی تھی جو اپنے بچوں کی تعلیم پر خرچ کرنے کی قدرت رکھتے تھے ، نجیب محفوظ کا اسلوب تنقیدی حقائق سے بھر پور ہے ، جسکی وجہ سے انکو مصر کے متوسط طبقہ کی تصویر کشی کرنے میں آسانی ہوئی ، اور وہ ہمارے لئے مصری معاشرہ اور اس وقت کی تاریخ کو سمجھنے میں ممد معاون ثابت ہوئے۔

سید عظمت اللہ بیابانی۔گلشن بیابانی، وجے نگر کالونی حیدرآباد

اُردوزبان

رات کے خیال سے تصور میں اندھیرا ابھرآتا ہے۔جب سورج کا تذکرہ ہوتا ہے تو اُجالے کا تصور ابھر آتا ہے۔یہ ایک فطری بات ہے کہ کچھ پھول ایسے ہوتے ہیں جو خوشبو بکھیرنے کے لیے تڑپتے ہیں۔ایسے بہت سے درخت ہیں جو سایہ دار ہوتے ہیں۔اسی طرح جب کسی اردو دان کا ذکر چلے تب اردو کی خدمت کا تصور سامنے آجاتا ہے۔خدمت کسی بھی طرح سے کی جاسکتی ہے لیکن کسی بھی طرح متضاد حرکتوں سے اس کی خدمت گویا کہ تخریبی حیثیت کی ہوجاتی ہے۔اکثر دیکھا گیا ہے کہ وہ حضرات جو اپنی جوانی کو پیچھے چھوڑے تیس چالیس کا سال کا عرصہ ہوا ہو،ایسے حضرات ہی اردو کی چاشنی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ان حضرات کے ہاتھوں میں اردو اخبار یا رسالے دیکھے جاسکتے ہیں۔

الیکٹرانک میڈیا کی وجہ سے اردو کی بڑھتی ہوئی عمر اور بڑھاپا ملتا گیا،جس طرف دیکھا جائے الیکٹرانک میڈیا میں کم سے کم اردو نظر آرہی ہے۔یہ سن کر تعجب نہیں ہوگا کہ بہت ہی مقبول ذریعہ تفریح جو سینما کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اس کی زبان حالانکہ اردو ہوتی ہے لیکن بتلایا جاتا ہے ہندی۔

احقر سیر و سیاحت سے کافی دلچسپی رکھتا ہے۔ مختلف مقامات کے دوروں میں الگ الگ صوبوں میں ان کی اپنی مادری زبان چلتی ہے۔شمالی ہندوستان کے اکثر مقامات جہاں اردو کا چلن زیادہ ہے، وہاں کے اخبار اور رسالے ہندی میں تبدیل ہوگئے ہیں۔کئی حضرات جو شمالی ہند سے جنوب کی طرف کا رخ کرتے ہیں تو ان کے ہاتھوں میں ہندی کے اخبار اور رسالے ملتے ہیں۔حد تو یہ ہے کہ مذہبی کتابیں بھی ہندی میں شائع کی جارہی ہیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ۱۹۶۷ء میں جب میں نظام آباد میں ایک غیر مسلم کے مکان میں کرایہ سے رہا کرتا تھا۔مالکِ مکان اردو میں خطوط لکھا کرتے تھے،ان کی تحریر بہت ہی پیاری ہوا کرتی تھی،جب میں کبھی حیدرآباد آتا تو اردو کی خدمت کے جذبے سے کبھی اردو اکیڈمی کے دفتر جاتا،اس وقت ذمہ دارانِ اکیڈمی لکھنے وغیرہ کے بہت سارے کام انگریزی میں کیا کرتے تھے۔کچھ عرصے بعد احقر کو ضلع کھمم میں رہنے کا موقع ملا۔وہاں کی اردو اکیڈمی کی لائبریری کافی دنوں سے مقفل تھی۔تلاشِ بسیار کے بعد معلوم ہوا کہ لائبریرین صاحب اللہ کو پیارے ہوگئے اور عارضی طور پر ایک صاحب اس کی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔ان دنوں اردو اکیڈمی کا دفتر شانتی نگر میں تھا۔جناب صدر سے ملاقات کرکے کھمم کی لائبریری کا ذکر کیا گیا۔اس ضمن میں بہت ساری کتابوں کی لسٹ بنا کر ان کی خدمت میں پیش کیا گیا تاکہ وہاں کے لائبریرین کا انتظام ہو اور ساتھ ساتھ کتابوں کی فراہمی بھی کی جائے۔ایوانِ اردو وادارہ ادبیات اردو پنجہ گٹہ کا ان دنوں اخبار میں اشتہار دیکھا گیا۔اشتہار میں یہ

نشاندہی کی گئی تھی کہ وہ پرانی نایاب کتابیں جو خستہ حالت میں تھیں اس کو حاصل کرنے کی خواہش کی گئی۔اس سلسلے میں جناب صدر سے ملاقات ہوئی کافی کتابیں لینے کا موقع ملا،اس ضمن میں یہ کہا گیا کہ وہ جو اپنائے ہوئے کتابوں کو اپنا کوئی پسندیدہ فقرہ لکھوائیں۔ہم ان تمام کتابوں کو جو ہم نے لیا،اس میں لکھوایا''اردو میری ماں''۔رقم کی وصولی کے بعد ادارہ نے فوری رسید نہیں بنائی۔کافی وقت کے بعد بہت ہی دقت سے اس کی رسید ملی۔کچھ عرصے بعد جب اردو ادب کا دفتر جج ہاؤس منتقل ہوا تو ہم چند احباب کے ساتھ دفتر پہنچے تا کہ کچھ رسائل لے سکیں۔اس وقت جو ذمہ دار حضرات تھے انہوں نے رقم لینے میں بہت تامل کیا۔ اس لیے کہ رسید بنانے والے منشی چھٹی پر ہیں، ایک اور دفتر جو حکومت کے زیر نگرانی چلتا ہے، وہاں ممبر بنانے کے لیے ایسے ہی کوشش کی گئی، ذمہ دارانِ اردو سیکشن یہ کہتے ہوئے تال مٹول کرنے لگے کہ رقم اکاؤنٹس سیکشن میں بھرنی چاہیے۔دہلی سے ایک اردو پرچے کی خریداری کے لیے ہم نے منی آرڈر کیا، پتہ بالکل صاف صاف لکھا، جیسا کہ انہوں نے پرچے میں بتایا تھا۔چند دنوں بعد منی آرڈر واپس آگیا۔

مذکورہ روداد بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ غیروں سے بھی اردو کے سلسلے میں بیر ہے اور اپنوں سے بھی اردو کو کم سے کم الفت ہو رہی ہے۔مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی جب ابتداء میں حیدرآباد کے گچی باؤلی علاقہ میں شروع ہوئی تب ہم نے دیکھا کہ ذمہ داروں کے نام وغیرہ کی تختیاں کہیں بھی اردو میں نظر نہیں آرہی ہیں۔ایک ذمہ دار سے جب ہم نے یہ سوال کیا کہ کیا باہر کے ممالک میں بھی اس کی کوئی شاخ کھلنے والی ہے؟ تو جواب دیا گیا کہ سعودی میں کھولنے کی کوشش ہونے والی ہے۔ہمارے یہاں باہر کا مطلب صرف سعودی ہے۔

جیسا کہ احقر نے سیر و سیاحت کے شوق کا ذکر کیا ،اس سلسلے میں یو ایس (U.S) جانے کا بھی اتفاق ہوا ۔وہاں کچھ لائبریریوں سے مستفید ہونے کا موقع ملا مجھے تعجب اس بات پہ ہوا کہ لائبریرین اردو کتابوں کا سیکشن بتا نہیں سکا، چونکہ اس کو معلوم ہی نہیں تھا کہ اردو نام کی کوئی زبن بھی ہے۔ایشائی زبانوں کے سیکشن میں اردو کے علاوہ چائنیز، ملائی، بنگلہ وغیرہ کی کتابوں کا پتہ ملا، بہت ساری کتابیں ہم نے اور ہمارے ساتھیوں نے اردو کی لیں۔ ہمارے قیام کے دوران بہت ساری اردو کتابیں ہفتہ ہفتہ میں پڑھی اور واپس کر دی گئیں۔ہم اور ہمارے اس پسند کی کتابیں انتخاب کرنے کے لیے کہا جو ہمیں انعام میں دینا چاہتے تھے۔وہاں کا نظام تھا ہفتے میں زیادہ کتابیں مطالعہ کرنے سے پسندیدہ ایک کتاب انعام میں دی جاتی تھی۔ہم آئے دن اخباروں میں یہ پڑھتے ہیں کہ یو ایس (U.S) کے فلاں شہر میں اردو مشاعرہ منعقد ہوا یا اردو کے خدمت گاروں نے ایک میٹنگ رکھی۔ہمیں تعجب ہوتا کہ یہ حضرات جو اردو کی خدمت کے بلند نعرے لگاتے ہیں، کبھی انہوں نے ان سرکاری لائبریریوں میں یاضری دی یا وہاں کی کتابوں کا مطالعہ کیا؟ ہم نے ماہِ ستمبر میں بہت ساری کتابوں کی فہرست دی، فہرست دیتے ہوئے یہ استدعا کی کہ یہ اردو کتابیں بھی لائبریریوں میں مہیا کی جائیں۔اب اردو کتابیں بھی الیکٹرانک میڈیا پر آن لائن مہیا کی جارہی ہیں۔ہم اپنے بچوں سے یہ خواہش ظاہر کی کہ الیکٹرانک میڈیا سے بات ہوتی ہی رہتی ہے لیکن ہر ماہ اردو میں ایک خط ضرور لکھا کریں۔

فضیل فوزؔ۔ حیدر آباد

اہلِ فلسطین کے نام

بھڑک اٹھے نہ کیوں شوقِ شہادت کا مرے جذبہ
نشانے پر ہے اسرائیل کے جو مسجد اقصیٰ
فلسطینی مسلمانوں کی جُرأت بے مثالی ہے
کھڑے ہیں ظالموں کے سامنے بھی تان کر سینہ
فلسطینی جوانوں کا نڈر پن دیکھ کر لوگو
حریفِ دیں کے ذہنوں پر ہوا طاری ہے اِک لرزہ
مظالم لاکھ سہہ کر بھی یہ کہتے ہیں فلسطینی
ہے 'بیت القدس' ہم سب کو ہماری جان سے پیارا
وہ اسرائیل کے ظالم مسلّط کیوں ہیں اقصیٰ پر
ہے مسلم حکمرانوں سے ہمارا بس یہی شکوہ
ندا آتی ہے روز و شب یہ اقصیٰ کے مناروں سے
کہاں ہے دہر میں فاتح صلاح الدین کے جیسا
خدایا صفحۂ ہستی سے تو اُن کو مٹا دے اب
کہ ہیں ناپاک نظریں جن کی سوئے قبلۂ اولیٰ
نہ گھبراؤ مسلمانو! وہ گھڑی جلد آئے گی
پلٹ جائے گا حکمِ رب سے اسرائیل کا تختہ
چھڑا کر مسجد اقصیٰ یہودی کے شکنجے سے
کریں گے ہم ادا اُس میں یقیناً فوزؔ پھر سجدہ

سید نوید جعفری۔ حیدر آباد

غزل

سوچ یہ بھی تو ذرا آگ لگانے والے
خود بھی جل جاتے ہیں اوروں کو جلانے والے

دل لگایا تو نہیں ہے مجھے ٹھوکر ہی لگا
رائے گانی کا صلہ دے مجھے جانے والے

دل دھڑکتا ہی رہا درد میں تنہا تنہا
ہم سکوت آشنا کب شور مچانے والے

میں جنوں پیشہ ہوں کیا عقل سے لینا دینا
ہوش میں مجھے کیوں لاتے ہیں زمانے والے

ہم کو شوریدہ سری راس نہ آئی ورنہ
ہم تو صحرا میں بھی تھے پھول کھلانے والے

اک تماشہ ہے سر راہ تحیر دنیا
اصل میں ہم ہیں کسی اور ٹھکانے والے

کتنی مانوس لگی دشت کی خوشبو بھی نویدؔ
پہلے شاید تھے یہاں عشق گھرانے والے

سیدہ تبسم منظور ناڈکر۔ممبئی

نیت

نیت کے معنی خدا کے لئے کام انجام دینے کا اردہ کرنا ہے۔روایات سے پتہ چلتا ہے ہر کام کی اہمیت اس کی نیت سے ثابت ہوتی ہے۔ انسانی عمل کا سارا دارومدار نیتوں پر منحصر ہے۔روایت کی کتابوں میں نیت کو اصل اور اعمال کا ثمرہ کہا گیا ہے اور مسلمانوں کو پاک اور مخلصانہ نیت رکھنے کی تاکید کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ خراب اور بری نیت رزق میں کمی اور بلاومصیبت کے نازل ہونے کا سبب بنتی ہے۔ہر نیک عمل کے پیچھے حسنِ نیت اور اخلاص کا ہونا ضروری ہے۔نیت اور عمل میں ایک خاص تعلق ہے اور کوئی بھی عمل حسنِ نیت کے بغیر قبولیت اور درجہ ؟ کمال کو نہیں پہنچتا۔اگر ہم زندگی میں کسی اچھے اور نیک کام کی نیت کریں اور بعد میں کسی رکاوٹ کے باعث نہ کر پائیں تو وہ کام نہ کرنے کیباوجود بھی ہمیں اس نیک نیت کا اجر مل جائے گا۔نیت خود ایک مطلوب عمل ہے۔یہ دل کا عمل ہے اور دل کے عمل کا درجہ جسمانی اعضاء کے اعمال سے زیادہ قوی ہوتا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آقا صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا،''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، اگر کوئی شخص کسی نیک کام کی نیت کر لے لیکن کسی مجبوری کے باعث نہ کر سکے تب بھی اس کے نامہ ؟ اعمال میں ایک نیکی لکھی جائے گی اور اگر وہ عمل کر لے تو پھر اس عمل کے کرنے پر دس گنا اجر لکھا جاتا ہے۔''(مسلم، الصحیح، 117:1، رقم:128)

ایک دوسری جگہ ارشاد فرمایا:''جو کوئی ایک نیکی لائے گا تو اس کے لیے (بطورِ اجر) اس جیسی دس نیکیاں ہیں''۔(سورۃ الانعام آیت نمبر 166) یہ نیکی کا کم سے کم اجر ہے۔ایک نیکی پر اجر کہاں تک بڑھتا ہے، حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:''ابن آدم کے ہر عمل میں روزے کے علاوہ نیکی کو دس سے سات سو گنا تک بڑھا دیا جاتا ہے۔''

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے،''بے شک روزہ میرے لیے ہے اور اس کی جزا میں خود دوں گا۔''(مسلم، الصحیح، 2: 807، رقم:1151)

نیکیوں اور درجات کے کم و بیش ہونے کی وجہ حسنِ نیت ہے۔نیت عمل کے پیچھے ٹمٹاتے ہوئے چراغ کی مانند ہے۔نیت کا یہ چراغ جس قدر روشنی دے گا، وہ عمل اسی قدر روشنی پا کر جگمگائے گا اور اجر وثواب پائے گا۔کسی شخص کی نیت ٹمٹماتے ہوئے چراغ جیسی ہے، کسی کی لائٹ جیسی، کسی کی چراغ جیسی کسی کی چاند جیسی اور کسی کی نیت سورج جیسی ہے۔جتنی روشنی اور نور جس کی نیت میں ہے، اسی قدر اس کے عمل کا ثواب بڑھتا جاتا ہے۔نیت کے اندر موجود سچ اور خلوص اس نیت کے نور، قوت، برکت، قبولیت اور درجے کو بڑھانے کا سبب ہے۔جیسے جیسے نیت کی قوت بڑھتی چلی جاتی ہے ویسے ویسے عمل کا درجہ اور اجر وثواب بھی بڑھتا چلا جاتا ہے۔اس کے برعکس اگر عمل میں دکھاوا پایا

جائے تو وہ محض ایک عمل بن جاتا۔ اس کا اصل مقصد فوت ہوجاتا ہے۔ اللہ کا ارشاد ہے، ”اور جو شخص دنیا کا انعام چاہتا ہے ہم اسے اس میں سے دے دیتے ہیں اور جو آخرت کا انعام چاہتا ہے ہم اسے اس میں سے دے دیتے ہیں۔“ (سورۃ آل عمران آیت نمبر 145)

حدیث مبارکہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ”بے شک اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔“ (1 بخاری، الصحیح، 1:3، رقم: 1 مسلم، الصحیح، 3:1515، رقم: 1907) نیت ایک ایسی جادوئی عمل ہیجو ہماری اِس عارضی زندگی کو ابدی زندگی میں تبدیل کرسکتی ہے اور عذاب اور بدبختی کی زندگی میں بھی بدل سکتی ہے۔ جو لوگ اس کا درست استعمال کریں گے ان کی زندگی کا کوئی پہلو بھی تاریک نہ رہے گا، بلکہ ان کی ساری زندگی روشن ہوگی اور وہ ہمیشہ اطمینان بخش زندگی پائیں گے۔ کیونکہ جب روزانہ فرائض اخلاص کے ساتھ ادا کیے جائیں تو ان پر ملنے والا اجر وثواب صرف ان کی ادائیگی کے اوقات تک محدود نہیں رہتا، بلکہ زندگی کے تمام لمحات کا احاطہ کرکے ان پر اپنے اثرات مرتب کرتا ہے۔

مومن بندے کے عارضی زندگی میں ابدی سعادت کو پانے اور کافر کے نصیب میں ہمیشہ کی بدبختی اور ندامت کے لکھے جانے میں یہی راز مضمر ہے۔ ورنہ ظاہری انصاف کا تقاضا تو یہ تھا کہ انسان کو اس کی عبادت اور نیکی کے مطابق جزا اور گمراہی کی سزادی جاتی۔ یعنی نیک آدمی اتنے ہی سال جنت میں رہتا، جتنے سال اس نے دنیامیں نیکی کے ساتھ گزارے اور گناہ گار اتنے ہی سال جہنم میں جلتا جتنے سال اس نے دنیامیں گناہوں میں گزارے۔ حالانکہ نیک یا بدانسان کی خلود تو وہ آخری نقطہ ہے جس سے پار کا انسان سوچ بھی نہیں سکتا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ابدی سعادت و بدبختی انسان کی نیت میں مضمر ہوتی ہے۔ جس طرح ابدی ایمان اور استقامت کا عزم ابدی سعادت کا ذریعہ ہے، اسی طرح ابدی کفر اور انحراف کا عزم ابدی بدبختی کا وسیلہ ہے۔

زندگی کے آخری لمحات میں بندگی کے احساس سے سرشار انسان ساری زندگی خواہ وہ ایک ہزار سال ہی کیوں نہ ہو۔ اسی طریقے پر گزارنے کے لیے پُرعزم ہوتا ہے، اس لیے اس کے ساتھ اسی عزم اور نیت کے مطابق معاملہ کیا جاتا ہے اور اس کی نیت کو حقیقی عمل کی حیثیت سے قبول کیا جاتا ہے اسی لیے کہا گیا ہے، ”مومن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے۔“ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس بارے میں اصل اعتبار انسان کی عارضی زندگی کا نہیں، بلکہ مستقبل کے بارے میں اس کی نیت کا ہے۔ اس نیت کی تجلیات اور ابدی سعادت پر ایمان رکھنے کی بدولت مومن ابدی جنت کا اور کافر ابدی جہنم کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ نیک نیت ہی مومن کی نشانی ہے۔ اور سارا دارومدار نیتوں پر منحصر ہے۔

قلم کاروں سے

ماہنامہ ”صدائے شبلی“ حیدرآباد میں اشاعت کے لیے معیاری اور تصحیح شدہ مضامین، نظمیں اور دیگر تحریریں ان پیج فائل میں ارسال کریں۔ غیر معیاری، غیر اصلاح شدہ اور کمپوزنگ کی بے شمار غلطیوں والے مضامین، نظمیں و دیگر تحریریں ہم شائع کرنے سے معذور رہیں گے۔

(مدیر)

تذکرۂ انبیاء

مبصر: **محمد یٰسین ھابیل**۔ حیدرآباد

ماہنامہ صدائے شبلی میں ہر ماہ ادارے کی طرف سے کتاب پر تبصرہ کیا جائے گا، اس لئے مصنفین، مولفین اور مرتبین سے گزارش ہے کہ وہ تبصرے کے لئے دوعدد کتابیں ضرور ارسال کریں۔ (ادارہ)

"تذکرہ انبیاء" کی مصنفہ نعیم بانوفضاء کی ہمہ گیر شخصیت، آپ کے اوصافِ حمیدہ، کردارِ حمیدہ اور لطیف لب ولہجہ یقیناً قابلِ تحسین ہیں۔ مصنفہ اپنی کم عمری سے ہی دینی رجحان کی طرف مائل تھیں، جس کی بناء پر اس مقدس کتابِ حیات قرآن حکیم کے گہرے مطالعہ سے اپنے آپ کو منسلک کرتی ہوئی اپنی کدوکاوش کو ایک عملی جامہ پہناتے ہوئے منزلِ مقصود پر فائز ہوگئیں جو کہ قابلِ رشک، قابلِ ستائش اور قابلِ تقلید کارنامہ ہے۔ اس فطری عمل کو میں کاتبِ کائنات سے منسوب کرتے ہوئے اس کو ترانہ عظیم سے تعبیر کرتے ہوئے چلوں گا کہ مصنفہ قدرت کی چنندہ شخصیات میں سے ایک ہیں اور ان کا یہ کارنامہ ایک عظیم سمندر سے موتیوں کو جمع کرکے ایک ہار کی شکل میں ہر اہلِ ایمان کو پیش کرنے کے مترادف ہے جو کہ ہرکس وناکس کی بس کی بات نہیں اور نہ ہی ہر ایک کے مقدر میں ہوسکتا ہے۔

مصنفہ کا بچپن سے ہی دین کی طرف مائل ہونا اور ہدایتِ قرآن پر عمل کرنا ان کے ضمیر میں دین کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ان کے ساتھ دامن گیر ہوگیا اور بڑھتا ہی چلا گیا اور آپ کا دینی ذوق ورغبت کو ملحوظ رکھتے ہوئے مصنفہ کے شوہر نے ان کا فراخ دلی اور روح شناسی سے بھرپور ساتھ دیا جو ہر مرد کے بس کی بات نہیں۔

مصنفہ نے کئی سال قرآن مع ترجمہ کی تعلیم حاصل کی اور عالمہ کی سند بھی حاصل کی۔ نیز اس کی بدولت قرآن

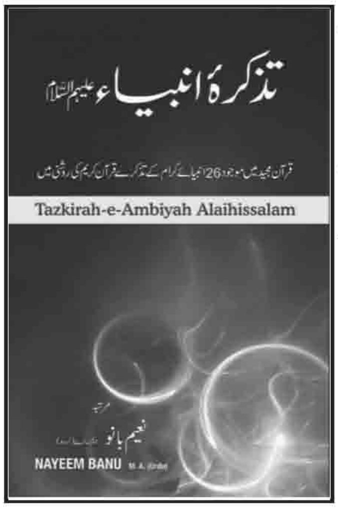

پاک کی آیات کا ذخیرہ "تذکرہ انبیاء" کو سمیٹنے میں مشغول ہوگئیں اور بہت ہی معیاری انداز میں اس تذکرہ کو پیش کرنے میں کامیاب ہوگئیں۔ قرآن کی روشنی میں جس کو عام دینی علم رکھنے والا بھی پڑھ کر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

منصفہ نعیم بانوفضاء اپنی قیمتی عمر کے چار سال "تذکرہ انبیاء" کو سلسلہ وار جمع کرنے میں اپنے آپ کو وقف کردیا جو کہ ہرکس وناکس کے اختیار وخیال سے کافی دور ہے۔

آپ نے تذکرہ کی مناسبت ایک ایک آیت قرآن مقدس کی روشنی میں سمیٹا ہے کہ ہر فرد جو دینی علم سے زیادہ واقف بھی نہ ہو وہ سمجھتے ہوئے اس کے فیضان سے مستفید ہوسکتا ہے اور تمام انبیاء جن کا ذکر منصفہ نے کیا ہے ہر فرد کے لیے مشعلِ راہ ہے۔

مثال کے طور چند چھوٹی آیات پیش کررہا ہوں۔

(۱) آل عمران آیت نمبر (۴۳) یٰمَرْیَمُ اقْنُتِیْ لِرَبِّکِ وَاسْجُدِیْ وَارْکَعِیْ مَعَ الرّٰکِعِیْنَ۔ (ص:۲۰، ترجمہ: "اے مریم فرمانبرادری کرتی رہو، اپنے رب کی اور سجدہ کیا کرو اور رکوع کرنے والوں کے

ساتھ"۔ یہ حضرت عیسی علیہ السلام کے تذکرہ سے لیا گیا ہے۔

(۲) البقرۃ آیت نمبر (۳۷) فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ. (ص:۱۲، ترجمہ: "پھر آدم نے اپنے ہی رب سے توبہ کے کچھ الفاظ سیکھ لیے (اور توبہ کی) تو اللہ نے ان کی توبہ قبول کرلی، وہ تو ہے ہی قبول کرنے والا، بڑا ہی رحم کرنے والا"۔ یہ حضرت آدم علیہ السلام کے تذکرہ سے لیا گیا ہے۔

بہرکیف مصنفہ نعیم بانو فضاء کی کتاب "تذکرہ انبیاء" کی اشاعت اور تکمیل پر میں آپ کو تہہ دل سے مبارکباد پیش کرتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ حضور ﷺ کے امتی اس کتاب سے زیادہ سے استفادہ کریں اور اپنے علم میں اضافہ کریں اور اس بیش بہا خزانے کو ہر ایک تک پہنچائیں اور اجر عظیم حاصل کریں۔

......(بقیہ ص:۲۶ کا)

تو ایسا لگتا ہے کہ وہ دور خدا سے بیزاری یا کم از کم مذہبی لٹریچر سے بیزاری کے نام پر الحاد کا ہوگا، خدا نہ کرے کہ ایسا ہو مگر امروز کی شورش میں اندیشہ؟ فردا کچھ ایسا ہی ہے۔ اس چیلنج سے نمٹنے کے لیے برہمن واد کے خلاف کام کرنے اور اس کام کے لیے مشترکہ محاذ بنانے کی ضرورت ہے، ذات پات اور برہمن واد اس ملک کا ناسور ہے، مستقبل کے چیلنجس نہ بھی ہوتے تو بھی ذات پات سے سماج کو پاک کرنا اور برہمن واد کی غیر انسانی آئیڈیالوجی کی جڑوں پر تیشہ چلانا ہمارا کام ہوتا اور اب جب کہ ہمارے سامنے مستقبل کے چیلنجس بھی ہیں ایسے میں ہماری ذمہ داری دوچند ہوجاتی ہے، ہمیں اسے لیے بھیجا گیا ہے کہ ہم غلام اور بھودیو (برہمن)، چھوت اور اچھوت، شودر اور دویجہ، اشراف وارذال کی غیر انسانی وغلامانہ طبقاتی تقسیم ختم کر کے خدا کے بندوں کو خدا کی غلامی کی طرف لائیں۔ ہماری بعثت کے مقاصد بتاتے ہوئے حضرت ربعی بن عامرؓ نے رستم کے دربار میں فرمایا تھا:

الله ابتعثنا لنخرج من شاء من عبادة العباد إلى عبادة الله وحده، ومن ضيق الدنيا إلى سعتها، ومن جور الأديان إلى عدل الإسلام.

(اللہ نے ہمیں بھیجا ہے؛ تاکہ ہم اللہ کے بندوں کو بندوں کی غلامی سے، اللہ کے حسب منشا، اللہ کی غلامی کی طرف لائیں، دنیا کی تنگی سے اس کی کشادگی کی طرف اور مذاہب کے ظلم سے اسلام کے عدل کی طرف لائیں)

کیوں چمن میں بے صدا مثل رم شبنم ہے تو؟
لب کشا ہو جا، سرود بربط عالم ہے تو

DR. S.J HUSSAIN
MD (Unani)
Former director Incharge
Central Research Institute Of Unani Medicine
Govt of India

website: www.unanicentre.com
Email:syedjalilhussain@gmail.com
jaleel_hussain@yahoo.com

Dr. Jaleel's

یونانی سینٹر فار کارڈیک کیر
UNANI CENTER FOR CARDIAC

Consultation Time
Morning:9:00 am to 3:00 pm-Evening:7:00 pm to 9:30 pm
(Friday Morning and Sunday Evening Closed)

Cell:
+91 8142258088
+91 7093005707

Adress -: No: 8-1-332/3/B-69, RoadNo 1(A)Arvind Nagar Colony
Tolichowk Hyderabad - 500008 T.S India

MADRASA ISLAMIA NAJMUL ULOOM
Shahi Hills, Near Masjid Noor Ali, Shaheen Nagar, Hyderabad.
SHIBLI INTERNATIONAL
EDUCATIONAL AND CHARITABLE TRUST

مدرسہ اسلامیہ نجم العلوم
شاہی ہلز نزد مسجد نور علی، شاہین نگر، حیدرآباد
Regd No: 180/2016

زیرانتظام: شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ............... گرامی قدر محترم! امید ہے کہ آپ اپنے متعلقین کے ساتھ بخیر وعافیت ہوں گے

حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے خَیْرُکُم مَن تَعَلَّم القُرآن وَعَلَّمَہ۔ تم میں سے بہترین انسان وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے۔ اس حدیث سے علم اور قرآن علم کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اسی علم کی نشر واشاعت کے لئے **مدرسہ اسلامیہ نجم العلوم** شاہی ہلز شاہین نگر حیدرآباد میں ۱۵؍جنوری ۲۰۱۷ء کو قائم کیا گیا تا کہ امت مسلمہ کے نونہالان زیور علم سے آراستہ ہوں اور ملک وملت کی خدمت میں وقف ہو جائیں۔ اللہ رب العزت ان مقاصد میں کامیابی عطا فرمائے۔ آمین یارب العلمین۔

مدرسہ ہذا اور ٹرسٹ کی کوئی مستقل آمدنی نہیں ہے۔ جملہ اخراجات کی ادائیگی اہل خیر حضرات کے تعاون سے ہوتی ہے۔ ٹرسٹیوں کے مشورے سے تین سو بائیس (322) ؍گز زمین شاہی ہلز شاہین نگر میں خریدی جارہی ہے، جس کی مجموعی قیمت 36؍لاکھ روپے ہے، فی گز 12؍ہزار روپئے ہے۔ 10؍لاکھ روپئے بطور بیع نامہ ادا کیا گیا ہے۔ اس زمین پر مصلیٰ، مدرسہ، لائبریری، دفتر اور ایک آڈیٹوریم بنانے کا ارادہ ہے۔ اس لیے اہل خیر حضرات سے گذارش ہے کہ صدقہ جاریہ کے طور پر تعاون فرما کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔

Bank Name: IDBI CURENT ACCOUNT
A/c Number: 1327104000065876
A/c Name: SHIBLI INTERNATIONAL EDUCATIONAL AND CHARITABLE TRUST
IFSC Code: IBKL0001327. Branch: Charminar

حافظ وقاری مفتی ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی خطیب مسجد عالیہ، بانی وناظم مدرسہ ہذا چیرمین شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد

Google Pay: **8317692718** WhatsApp: **9392533661**